اور ان کی حقیقت نگاری، مصوری، طرز ادا کی سلاست وسادگی، زبان کی پاکیزگی اور عروضی وصوتی خصوصیات کے لحاظ سے ان کو بلند پایہ شاعر مانا گیا ہے، آخر میں انیسؔ کی حیثیت کا تعین اور مرزا دبیرؔ سے ان کا موازنہ کر کے دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک حیثیت سے اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں، مگر غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح آفاقی شاعر نہیں ہیں، شروع میں مرثیہ کو اردو کی طبعزاد صنف کلام بتایا گیا ہے، جو سراسر غلط ہے، مراثی عرب جاہلی کی شاعری میں موجود ہیں، خاص واقعۂ کربلا کے متعلق بھی اردو سے بہت پہلے فارسی میں نظمیں موجود ہیں، البتہ یہ صحیح ہے کہ اردو کے مرثیہ گویوں نے اس کو بہت آگے بڑھا دیا، انیسؔ کی شاعری پر جو اعتراضات کیے ہیں، اُن میں سے اگرچہ بعض صحیح ہیں، لیکن اکثر مصنف کے خود ساختہ پیمانوں کا نتیجہ ہیں، انیسؔ کی جذبات وحقیقت نگاری وغیرہ کا موازنہ مغربی زبانوں کی شاعری سے کرنا صحیح نہیں ہے، دیکھنا یہ چاہیے کہ اردو شاعری میں جو چیزیں سرے سے نہیں تھیں، یا بہت ابتدائی درجہ میں تھیں، ان کو انیسؔ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس حیثیت سے انیسؔ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، مصنف نے تنقید میں جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ بھی کسی سنجیدہ تحریر کے شایان شان نہیں، تاہم اس کتاب سے تنقید سے متعلق مفید نکتے بھی معلوم ہوتے ہیں،

**معاویہ رضؓ بن سفیان**، مرتبہ جناب سلام اللہ صاحب صدیقی تقطیع خورد کاغذ معمولی کتابت وطباعت متوسط، صفحات ۱۰۰ مجلد، قیمت عہ مکتبہ انسانی برادری سعادت گنج لکھنؤ ۳

سلام اللہ صدیقی صاحب کی اسلامی تاریخ پر اچھی نظر ہے، اس سے پہلے وہ بعض صحابہ اور بنو امیہ کے متعلق کتابیں لکھ چکے ہیں، اور اب انھوں نے مشہور صحابی اور مدبر فرمانروا حضرت امیر معاویہؓ کے حالات، اخلاق، فضائل اور کارنامۂ زندگی کا مرقع پیش کیا ہے، حضرت امیر معاویہؓ کی سیرت کے بعض پہلو بہت نازک ہیں، لائق مصنف نے افراط وتفریط سے بچکر انکو بھی خوبی سے نباہا ہے، آخر میں حضرت امیر معاویہؓ پر بعض بے سروپا اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے، اس موضوع پر اردو میں بہت لکھا جا چکا ہے، مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے سیر الصحابہ جلد ششم میں بہت مفصل اور محققانہ معلومات تحریر کیے ہیں جس پر اضافہ نہیں کیا جا سکتا، تاہم مصنف کی محنت بھی قابل داد ہے۔ ’ض‘

---

جلد ۹۸ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۶ء عدد ۶

## مضامین



## مقالات



## ادبیات

# شذرات

ہندوستان کے مختلف فرقوں کے سول کوڈ میں یکسانیت پیدا کرنے کا مسئلہ دب دب کر ابھرتا ہے، ایک مرتبہ یہ سوال اٹھا تھا اگر مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے دب گیا تھا، اب پھر پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی، پارلیمنٹ کے ممبروں کا اس کیلیے اصرار ہے اور حکومت بھی آمادہ معلوم ہوتی ہے، اس میں مسلمانوں کا پرسنل لا بھی آتا ہے، اس لیے یہ فیصلہ کئی پہلوؤں سے حکومت کے لیے قابلِ غور ہے، مسلمانوں کا پرسنل لا خود ان کا بنایا ہوا نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید اور احادیث نبوی پر مبنی ہے، اس لیے وہ دوسری قوموں کے پرسنل لا کی طرح محض ایک معاشرتی نہیں بلکہ مذہبی مسئلہ بھی ہے جس میں خود مسلمان بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، ہندوستان کے دستور نے ہر قوم و ملت کے مذہب و کلچر کے تحفظ کی پوری ضمانت دی ہے، اس لیے حکومت کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے، وزیر قانون نے اس بارہ میں اسلامی حکومتوں سے استصواب کا حوالہ دیا ہے لیکن اس معاملہ میں انکا عمل دلیل نہیں ہے، اگر کسی اسلامی حکومت نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں کوئی تبدیلی کی ہے تو اس سے ہندوستانی مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا جواز نہیں نکل سکتا، بعض اسلامی ملکوں نے مغربی قوموں کی تقلید میں بہت سی چیزیں اسلام کے صریح خلاف رائج کر دی ہیں، مگر خود انکی قوم نے انکو خوشی اور رضامندی سے قبول نہیں کیا اور جمہور مسلمان ان کو اسلام کے خلاف ہی سمجھتے ہیں،

~~~~~~~~

اسکے علاوہ اسلامی حکومتوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن میں بڑا فرق یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومتیں مغربی قوموں کی تقلید میں کوئی غلط قدم اٹھاتی ہیں تو اسکا احساس ہو جانے کے بعد اسکی تلافی بھی کرتی ہیں، ٹرکی حکومت کی مثال سامنے ہے، مصطفے کمال نے ٹرکی قوم کے جذبات کے خلاف بعض دینی قوانین کو بدل دیا تھا لیکن انکے بعد کی حکومت کو قوم کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا اور وہ قوانین منسوخ کرنا پڑے، یوں تو اب بھی ٹرکی میں مغربیت کے بہت سے مظاہر ہیں لیکن اسی کیساتھ حکومت کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات و ضروریات کا بھی پورا لحاظ ہے، مثلاً سب سے اہم مسئلہ

شذرات ۴۰۳ معارف نمبر ۶ جلد ۹۸

مذہبی تعلیم کا ہے، ٹرکی میں ہر مسلمان طالب علم کے لیے بنیادی مذہبی تعلیم لازمی ہے، اور اعلیٰ مذہبی تعلیم کیلیے بڑے بڑے تعلیمی ادارے ہیں اس سے ایک حد تک مغربیت کی اندھی تقلید کی تلافی ہو جاتی ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ پوزیشن نہیں ہے، اس لیے انکا قیاس اسلامی ملکوں کے مسلمانوں پر صحیح نہیں ہے، ہماری حکومت کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی حکومتوں نے اپنی اقلیتوں کے پرسنل لا میں کوئی تبدیلی کی ہے یا نہیں، اگر کی ہے تو البتہ کسی حد تک اس کا جواز نکل سکتا ہے، لیکن اس کی مثال نہ مل سکے گی، ان کی رواداری کا تو یہ حال ہے کہ انھوں نے تو اقلیتوں کی بت پرستی تک میں جو ان کے عقیدۂ توحید کے سراسر خلاف ہے، کوئی مزاحمت نہیں کی، اس لیے ہماری حکومت کو سول کوڈ میں یکسانیت پیدا کرنے کے خیال سے باز آجانا چاہیے، کم سے کم مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہیے، وہ کسی حال میں اس کو قبول نہیں کر سکتے، ورنہ آج پرسنل لا میں تبدیلی کیجائے گی، کل قدم اور آگے بڑھے گا، اور مسلمانوں کی ساری ملی خصوصیات رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گی،

~~~~~~~~

جناب فخر الدین علی احمد کی خیرخواہانہ اور مخلصانہ کوششوں سے یہ امید ہو چلی تھی کہ مسلم یونیورسٹی اور اردو کے متعلق مسلمانوں کے تمام مطالبات جلد مان لیے جائیں گے، مگر طلبہ کے مقدمات اٹھانے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا، پولیس اسی طرح یونیورسٹی کے احاطہ میں مسلط ہے، اس کا اقلیتی کیرکٹر باقی رہنے یا نہ رہنے کا پتہ نیا بل آنے کے بعد چلے گا، جو معلوم نہیں کب تک پیش ہو، آج ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کے طلبہ نے ایک قیامت برپا کر رکھی ہے، لیکن کسی یونیورسٹی پر کوئی عتاب نازل نہیں ہوا، اور مسلم یونیورسٹی اب تک اسکا شکار ہے، اردو کے معاملہ میں کچھ بیانات دیکر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے، جب مسلمان باتوں میں بہل جاتے ہیں تو حکومت اس سے زیادہ زحمت کیوں اٹھائے، حکومت پر تو مسلمانوں کا بس نہیں ہے، لیکن ووٹوں کی قوت ان کے اختیار میں ہے، اگر وہ متحد ہو کر ان کو استعمال کریں تو البتہ حکومت متاثر ہو سکتی ہے، کم سے کم وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کی خود غرض جماعتوں کے نمایندوں کو اپنے ووٹوں سے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں نہ جانے دیں.

~~~~~~~~

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اصل میدان تو مذہبی و علمی تھا لیکن شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی اور کبھی کبھی تفننِ طبع کے طور پر یا واقعات سے متاثر ہو کر شعر بھی کہتے تھے، بادۂ عرفان شاعری کے لیے شراب طہور
~~~~~~~~

کی تاثیر رکھتا ہے، اس لیے سلوک وتصوف کے کوچہ میں آنے کے بعد شاعری کا ذوق بڑھ گیا تھا لیکن رنگ بدل گیا تھا اور انکے تغزل نے روحانی اور وجدانی کیفیت اختیار کرلی تھی چنانچہ اس دور کا چند برسوں کا کلام پوری عمر کی شاعری کے برابر کیفیت میں اس سے بڑھ کر اور باطنی واردات اور کوائف سے معمور ہے، ان کے مسترشد مولوی غلام محمد صاحب مصنف تذکرۂ سلیمان نے ان کے کلام کا مجموعہ "ارمغان سلیمان" کے نام سے مرتب کیا ہے، اور حضرت سید صاحبؒ کے داماد سید محی الدین صاحب نے اس کو شائع کیا ہے، جو دو حصوں میں تقسیم ہے، آخری دور کا کلام "غزل الغزلات" کے نام سے شروع میں ہے اور پہلے دور کا آخر میں ہے، پہلے دور کے کلام میں غزلیں، قومی وملی اور سیاسی وتاریخی نظمیں وغیرہ ہیں، لیکن اس مجموعے کی روح دوسرے دور کا کلام ہے، جو صحیح معنوں میں "غزل الغزلات" کا نمونہ ہے، اسکی قیمت تین روپے ہے، سید محی الدین ۱۰۹ عالمگیر روڈ شرف آباد کراچی سے ملے گا۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے مدینہ اخبار کے بانی مولوی مجید حسن صاحب مرحوم نے وفات پائی، وہ اردو صحافت کے سب سے پرانے رکن تھے، موجودہ اردو اخبارات میں مدینہ سے پرانا اخبار کوئی نہیں، اب تو بہت سے روزنامے نکلتے ہیں، اس لیے سہ روزہ اخبار کی کوئی قدر نہیں رہ گئی، ایک زمانہ میں مدینہ دیہات دیہات میں پھیلا ہوا تھا، اور بہت سے ہونہار اہل قلم نے اس کی بدولت شہرت حاصل کی، مدینہ شروع سے قوم پرور رہا، اور اس نے ملک وملت دونوں کی یکساں خدمت انجام دی، مدینہ پریس سے متعدد اہم مذہبی کتابیں شائع ہوئیں، اللہ تعالیٰ اس کے بانی کی مغفرت فرمائے۔



# مقالات

## تہذیب کی تشکیلِ جدید

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تہذیب کی تعریف میں ابتک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) وہ اخلاق وعادات جن سے خاص قسم کی موزونیت ودلکشی پیدا ہوتی ہے،

(۲) وہ اشیاء جو انسان کے حسن ذوق وحسن عمل سے وجود میں آتی ہیں،

(۳) وہ معیار جن پر زندگی پرکھی جاتی ہے،

(۴) اصول وقوانین اور اجتماعی ادارے،

(۵) زندگی کا مکمل نصب العین

(۶) اقدار کا ہم آہنگ شعور

(۷) علوم وفنون اور بدائع وصنائع وغیرہ

**تہذیب کی حقیقت** در اصل "تہذیب" عربی لفظ ہے جس کی حقیقت تک رسائی کے لیے کلام عرب کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، لسان العرب میں ہے:

اصل التهذيب تنقية الحنظل من شحمه ومعالجة حبه حتى

تہذیب کی اصل "حنظل" کو اندر کی تمام چیزوں سے صاف کرنا اور اسکی کڑواہٹ دور کرکے

تذھب مرارته ویطیب اکلہ[۱] "دانہ" کو اس قابل بنانا کہ کھانے والے کیلئے خوشگوار ہوجائے"

مشہور شاعر اوس نے کہا ہے:

الم تریا اذ جئتما ان لحمها | به طعم شری لم یهذب وحنظل
---|---

حنظل (اندرائن) کا پھل کڑواہٹ میں ضرب المثل ہے اور "شحم" سے دانہ کے سوا اندر کی تمام چیزیں مراد ہیں،

قاموس میں ہے

شحم الحنظل ما فی جوفه سوی حبه[۲] دانہ کے سوا حنظل کے جوف میں جو کچھ ہو وہ شحم ہے

تاج العروس میں تہذیب کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں:

اصل التهذیب والهذب تنقیة الاشجار بقطع الاطراف تزید نموا وحسنا ثم استعملوه فی تنقیة کل شئ واصلاحه وتخلیصه من الشوائب حتی صار حقیقة عرفیة[۳]

تہذیب اور ہذب کی اصل درختوں کی کاٹ چھانٹ کرنا تاکہ انکے حسن اور نشو ونما میں اضافہ ہو، پھر بعد میں ہر شی کی صفائی اصلاح اور عیوب سے خالص کیلئے اسکا استعمال ہونے لگا اور اسکی حقیقت عرفیہ بن گیا،

ان تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب کی اصل حقیقت کسی چیز کی ناخوشگواریوں کو دور کرنا اور کاٹ چھانٹ کر ایک خاص سانچہ میں ڈھال لینا ہے،

**تہذیب کی وسعت** یہ ناخوشگواریاں کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں ہیں، بلکہ نفسیات سے شروع ہوکر عقائد و تصورات، افکار و احساسات شخصی و انفرادی زندگی، عائلی و معاشرتی تنظیم، معاشی و سیاسی نظام، فلسفہ و اخلاق وغیرہ، سب میں پائی جاسکتی ہیں، اور تشکیل جدید میں حسب ضرورت ہرایک کی تہذیب ضروری ہے،

۱؎ لسان العرب ہذب ۲؎ قاموس شحم ۳؎ تاج العروس فصل الہاء من باب الباء، ہذب،



لیکن چونکہ نفسیات تمام چیزوں کا سرچشمہ ہے، اس بنا پر ذیل کے تہذیبی مباحث کو دو حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے: (۱) نفسیاتی تکوین اور (۲) عملی تشکیل۔

## (۱) نفسیاتی تکوین

**مغربی تہذیب میں نفسی ساخت کی توجیہ** مغربی تہذیب نے انسان کی جو توجیہ کی ہے اُس کے لحاظ سے جسمانی ساخت کی طرح انسان کی نفسی ساخت بھی حیوان کی ترقی یافتہ شکل قرار پاتی ہے، یعنی جس طرح تدریجی ارتقاء نے جسمانی اعضاء میں کام کیا ہے کہ ان کو نہایت ادنی حالت سے ترقی کرکے اعلی حالت تک پہنچا یا ہے بعینہ اسی طرح یہ اصول نفسی ساخت میں جاری رہا ہے، اور اس کی تمام خصوصیات حیوانیت سے ارتقاء کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی ہیں،

اس میکانکی توجیہ میں کسی اور "توانائی" کا وجود نہیں تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ انسان میں تمامتر وہی جبلتیں (عمل کی پیدائشی قوت محرکہ) مانی گئی ہیں، جو حیوان میں پائی جاتی ہیں، ان کے سوا خصائص انسانی کے لیے نہ کوئی مستقل جبلت ہے اور نہ پیدائشی طور پر ان کا کسی جبلت سے تعلق ہے، اسی طرح فطری طور پر انسان میں نہ خود شعوری کا وصف ہے اور نہ اس میں کسی ذی شعور طاقت کی کارفرمائی ہے، بس جو کچھ ہے وہ جبلتوں کے باہمی امتزاج کا ثمرہ اور مادہ کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ، اور وراثتاً و روایتاً اور بعد کے غور و فکر کا پیدا کردہ ہے،

اس توجیہ کے لحاظ سے انسان کا نیچرل کانسٹی ٹیوشن محض حیوانی جبلتوں پر مشتمل قرار پاتا ہے، اور صرف یہی جبلتیں انسان کے سارے اوصاف و خصائص کا ماخذ تسلیم کیجاتی ہیں حتی کہ عقل و ارادہ کا استعمال بھی ان ہی کی تسلی و تشفی کے لیے ہوتا ہے، جس کی بنا پر انسان کی اصل وضع مادی قرار پاتی ہے، اور مادہ کی وقتی قوتوں کے آگے انسان بے بس ثابت ہوتا ہے، اسی طرح فلسفہ و تاریخ اور مذہب و اخلاق ہر ایک میں مادیت ہی سرایت نظر آتی ہے،

**یہ صرف ایک طریق مطالعہ ہے کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے**

بدقسمتی سے موجودہ تحقیقات میں اس توجیہ کو بڑی اہمیت دیدی گئی ہے، حالانکہ یہ صرف ایک طریق مطالعہ ہے، کوئی قطعی اور مکمل فیصلہ نہیں ہے، جیسا کہ خود ولیم میکڈوگل نے اپنی مشہور کتاب "اساس نفسیات" کے آخر میں اعتراف کیا ہے:

گذشتہ صفحات میں ممکن ہے قارئین کو محسوس ہوا ہو کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ادّعا اور مغرورانہ و متکبرانہ انداز میں لکھا ہے، گویا ذہنی عمل اور ذہنی ساخت کو جس طرح میں نے بیان کیا ہے وہ صحیح ہے، اس کے علاوہ کوئی اور بیان بھی صحیح نہیں ہے،

لیکن میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بہترین بیان ہے جس میں تیس سال کے گہرے مطالعہ کے بعد پہنچ سکا ہوں، مجھے احساس ہے کہ میرے نتائج محض قابلِ عمل قیاسات ہیں، جن میں ممکن ہے غلطی زیادہ ہو اور صحت کم۔"[1]

پھر آگے چلکر کہتا ہے:

میں قارئین میں یہ خیال پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ نفسیات میں اس وقت تک محض ابجد کی تعیین سے اور زیادہ کچھ کام ہو سکا ہے،[2]

**تجربات و مشاہدات سے نقص کا ثبوت**

تجربات و مشاہدات سے بھی اس توجیہ میں نقص کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً

(۱) انسان کی بیشمار تخلیقی و تنظیمی صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نفسیات میں کوئی اور "توانائی" ضرور موجود ہے، جو فطری و خلقی ہے، اور ابتدا ہی سے حیوان و انسان کی نفسیات میں بنیادی فرق پیدا کرتی ہے،

(۲) زندگی میں روحانیت کے مستقل مظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ پیدائشی طور پر اس کی کوئی مستقل بنیاد ہے جو محض ارتقا کا نتیجہ نہیں ہے،

---

[1] اساس نفسیات مستقبل کے بعض اہم مسائل ص ۴۱۵ [2] ایضاً



(۳) بسا اوقات مذہب و اخلاق پر عمل کرنے کا دباؤ اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان اس کے مقابلہ میں طبعی تقاضوں کی پروا نہیں کرتا، اگر نفسی ساخت میں جبلت کے علاوہ اور کوئی "توانائی" تسلیم کی جائے تو اس حالت کے لیے کوئی گنجایش نہیں نکلتی ہے، حالانکہ یہ مسلّمات میں سے ہے جس سے انکار کی گنجایش نہیں ہے،

(۴) زندگی کے بہت سے لمحات میں وجدان، حواس اور عقل سب کی رہنمائیاں جواب دیدیتی ہیں، اور انسان کو کسی اور رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، جس سے نفسیات میں کچھ ایسے مخفی تاروں کی نشاندہی ہوتی ہے، جن کو چھیڑے بغیر زندگی کی "ساز" میں سوز نہیں پیدا ہوتا،

(۵) اگر انسان میں سب کچھ جبلت، وراثت اور روایت ہی کا پیدا کردہ ہے تو پسند و ناپسند کا معیار کہاں سے آتا ہے، جس کی بنا پر انسان بعض کاموں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند کرتا ہے، بعض باتوں کو قبول کرتا ہے اور بعض کو ترک کرتا ہے۔

غرض نظریۂ جبلت میں اس قسم کی بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ "اصل حقیقت" تک اس کی رسائی نہیں ہو سکی ہے، اور نفس انسانی میں جبلت کے علاوہ کوئی اور توانائی ضرور موجود ہے جس سے ان تمام حالتوں اور کیفیتوں کا تعلق ہے، جب تک اس کو تسلیم کیا جائیگا نفسیات و اخلاقیات کا رشتہ قائم نہ ہوگا۔ اور نہ ان کے ساتھ روحانیت کا صحیح ربط پیدا ہو سکے گا،

**نیچرل کانسٹی ٹیوشن میں ایک توانائی موجود ہے**

قرآن حکیم نے انسان کے "نیچرل کانسٹی ٹیوشن" میں ایک ایسی ہی "توانائی" سے روشناس کرایا ہے جس کا نام "فطرت" ہے، اور اس کی خاصیت "نورانی" ہے،

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا[1] — اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ[2] — ہر بچہ فطرت (دین) پر پیدا ہوتا ہے پھر اسکے والدین اسکو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا تے ہیں،

---

[1] سورہ روم رکوع ۳ [2] بخاری و مسلم از مشکوٰۃ کتاب القدر

ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے

| | |
|---|---|
| کما تنتج البهیمة بهیمة جمعاء | جیساکہ بکری کا بچہ صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے، اس میں |
| هل تحسون فیها من جدعاء[1] | "کن کٹے" کا عیب نہیں پایا جاتا ہے، |

یہی حال انسان کا ہے کہ اپنی پیدائش کے ابتدائی مرحلہ میں تمام عیوب سے پاک وصاف ہوتا ہے، فطرت کے اصل معنی "آٹا گوندھ کر خمیر آنے سے پہلے روٹی پکانا" ہے[2]

قاموس میں ہے:

| | |
|---|---|
| تفطر العجین اختبزه من ساعته | "تفطر العجین" اس وقت کہتے ہیں جبکہ آٹا گوندھ کر |
| ولم تخمر[3] | خمیر آنے سے پہلے روٹی پکائی جائے |

پھر یہ لفظ معنی میں توسیع کے بعد کسی شئے کو خاص ہیئت پر ایجاد کرنے اور گھڑنے میں بھی استعمال ہونے لگا[4]،

جیساکہ "فطر اللہ الخلق" کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں

| | |
|---|---|
| وهو ایجاده الشئ وابداعه | کسی چیز کو ایسی ہیئت پر گھڑنا کہ جس کام |
| علی هیئة مترشحة تفعل من | کے لیے اس کو پیدا کیا گیا تھا وہ اس کے |
| الافعال[5] | لائق ہوجائے، |

مذکورہ آیت میں "فطرۃ اللہ" سے

| | |
|---|---|
| هی مارکز فیه من قوته علی | اللہ کی فطرت سے وہ قوت مراد ہے جو |
| معرفة الایمان[6] | ایمان کی معرفت کیلئے اس میں بھردی گئی ہے |

---

[1] بخاری ومسلم (مشکوۃ کتاب القدر) [2] معجم القرآن از لغات القرآن فطرت [3] قاموس فطر [4] مجمع البحار ج فطرت
[5] مفردات القرآن امام راغب فطرت [6] ایضاً



اس توانائی کا سرچشمہ ماورائے مادہ ہے

یہ قوت (توانائی) جبلتوں کے باہمی امتزاج اور مادہ کے عمل ورد عمل کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ ماورائے مادہ ہے،

| | |
|---|---|
| ثم سوٰه ونفخ فیه من روحه | پھر اللہ نے انسان کو درست کیا اور اس میں |
| وجعل لکم السمع والابصار | اپنی روح پھونکدی اور تمھارے لیے کان، |
| والافئدة (سورہ سجدہ رکوع ۱) | آنکھ اور دل بنایا |

یہی توانائی خصائص انسانی کا ماخذ اور تسخیر کائنات کا پیش خیمہ ہے

| | |
|---|---|
| فاذا سویته ونفخت فیه من روحی | پھر جب میں انسان کو درست کرلوں اور |
| فقعوا له سٰجدین | اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم (فرشتے) |
| (سورہ حجر رکوع ۲) | اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑو |

اسکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے مزید وضاحت ہوتی ہے،

| | |
|---|---|
| لا اجعل من خلقته بیدی و | جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا |
| نفخت فیه من روحی کمن قلت | اور اس میں اپنی روح پھونکی اس کو ان مخلوقات |
| له کن فکان | کے برابر نہ کرونگا جن کے لیے میں نے لفظ "کن" |
| (مشکوۃ باب بدء الخلق) | کہا اور وہ وجود میں آگئیں، |

نفسیاتی تکوین میں اسی توانائی کی رونمائی ہے

تشکیل جدید کی نفسیاتی تکوین میں اسی فطرت کی رونمائی ہے جس کے بعد انسان کی نفسی ساخت "نورانی" بنجاتی ہے، اور زندگی مادہ کی پیداوار نہیں رہتی بلکہ اس کا سرچشمہ ماورائے مادہ قرار پاتا ہے،

اس "تکوین" میں مادہ کے وجود سے انکار نہیں ہے، لیکن اس میں، روح کی بھی آمیزش ہوتی ہے، مادہ کی وحشت دور ہوجاتی ہے، اور انسان اپنی خودی کو محفوظ رکھکر اس کی تسخیر کرتا ہے، پھر مادہ خود "توانائی"

میں تبدیل ہو کر اس کی حقیقت ماورائے مادہ قرار پاتی ہے اور اخلاقیات کے لیے ایک مستحکم بنیاد بن جاتی ہے جس سے نفسیات سے اس کا رشتہ جوڑنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی،

**جبلت میں نورانیت وحیوانیت دونوں کی آمیزش ہے**

نیچرل کانسٹی ٹیوشن میں فطرت کی کارفرمائی تسلیم کرنے کے بعد دو قسم کی نفسیاتی بنیادیں قرار پاتی ہیں (۱) نورانی اور (۲) حیوانی

نورانی، فطرت کی پیدا کردہ ہے اور حیوانی اجزائے ترکیبی کے خواص سے وجود میں آتی ہے، پھر ان دونوں کی آمیزش سے انسانی جبلت کی تکوین ہوتی ہے، جو حیوانیت و نورانیت دونوں سے مرکب ہوتی ہے،

مغربی تحقیق کے مطابق جبلت ہی سے انسان کے پیدائشی اور طبعی رجحان کی تکوین ہوتی ہے، پھر اسی سے ذہنی قوتوں کی تخلیق ہوتی ہے،

یہ ذہنی قوتیں متضاد قوتوں کے تصادم کی مرہون منت ہیں، یعنی طبعی رجحان میں دونوں کی آمیزش سے ایک قسم کی تصادمی قوت پیدا ہوتی ہے، یہی قوت ذہنی قوتوں کو جنم دیتی ہے، پھر یہ قوتیں کل خیالات اور تحریکات کا سرچشمہ بنکر انسان کی شخصی و معاشرتی زندگی کو برقرار رکھتی ہیں،[1]

**آمیزش تسلیم کرنے کے نقصانات**

اگر جبلت میں متضاد قوتوں (حیوانیت و نورانیت) کی آمیزش تسلیم کیجائے اور تمام تر وہی جبلتیں مانی جائیں جو حیوان میں پائی جاتی ہیں تو تضادمی قوت کے سرچشمہ کی سراغ رسانی ناممکن ہو جاتی ہے،

اسی طرح ان تمام متضاد صفتوں اور خصلتوں کا ماخذ نہیں معلوم ہو سکتا جن پر انسان کی برائی و برتری کا مدار ہے،

اس سے انکار نہیں ہے کہ نفسیات کی کتابوں میں ایک ایسی فطرت کا ذکر ملتا ہے جو حیوانی

[1] معاشرتی نفسیات ص ۱۴ مصنفہ ولیم میکڈوگل



جبلتوں کی بتدریج ترقی اور تاثیر و تاثر کے عمل سے بعد میں ظاہر ہوگئی ہے،

لیکن نہ اس کو "توانائی" کی حیثیت دیگئی ہے اور نہ جبلت کی تکوین میں اس کو دخیل مانا گیا ہے،

اس بنا پر متقابل صفات کی پیدائش اور انسان و حیوان کے درمیان امتیازات میں اس کا کوئی مؤثر عمل ثابت نہیں ہوتا،

**مغربی توجیہ میں ابتدائی انسان کا نفسیاتی مطالعہ**

مذکورہ توجیہ میں ابتدائی انسان کا جس طرح نفسیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اس سے مزید وضاحت ہوتی ہے، ابتدائی انسان کی تفصیل یہ ہے:

انسان کی دو قسمیں ہیں، طبعی (موگلی) انسان اور مصنوعی انسان،[1] (۱) طبعی انسان سے وہ ابتدائی انسان مراد ہے جس نے اعلیٰ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے مرحلہ میں قدم رکھا، مگر انسانی روایات نے ابھی اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے، (۲) مصنوعی انسان وہ ہے جو صنعت کی پیداوار ہے یعنی اس میں روایتی علم و عقائد اور احساسات و افکار کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے،

طبعی انسان میں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں،

"وہ ان تمام احساسی قابلیتوں سے متمتع ہوگا جن سے کہ ہم متمتع ہوتے ہیں، نیز اسکی ادراکی تمیز بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوگی، جیسا کہ اکثر وحشیوں کی ہوتی ہے، اس میں بھی وہی جبلتیں ہوں گی جن کے متعلق ہم یہ فرض کرنے کے باوجود دیکھ چکے ہیں کہ وہ تمام اعلیٰ غولی دودھ پلانے والے جانوروں میں مشترک ہوتی ہیں، وہ بھی مختلف اشیاء و مواقع کے ادراک پر اپنی جبلتوں کے طبعی غایات کے حصول کی ہیجانا کوشش کرتا ہو، اسکو بھی اپنی جبلتوں کی اشتہا، فزوں طلبوں اور ان جذبی تحریکات کا تجربہ ہوتا ہو جو ان جبلتوں کیلئے مخصوص ہیں، اسکو بھی ہیجانی کوششوں کی کامیابی پر خوشی یا تشفی ہوتی ہو، اور ان کوششوں میں ناکامی یا ان میں رکاوٹ پر افسوس و عدم تشفی کا تجربہ ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں تو اس میں ہوں گی لیکن زبان کے نام سے چند جذبی چیخوں، آوازوں

[1] اساس نفسیات باب ہفتم

اور چند اشاروں کے سوا کچھ نہ ہوگا،[1]

"طبعی" کی زندگی میں انسانی خصائص موجود نہ ہوں گے۔

"اس زندگی میں عقل، اصول، ضمیر اور فرائض سب کے سب غائب ہوتے ہیں، اس میں مسرت کی مسرت کی خاطر وہ تلاش نہیں ہوتی جو الم کے اجتناب سے متغیر ہوجاتی ہے، اس میں زنجیری اضطرارات کا سلسلہ نہیں ہے، یہ جبلی ہیجان اور خواہش کی زندگی ہے ........

جائے قیام اور طرز معاشرت کا حال معلوم نہیں ہے۔

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس سطح پر ہم نے انسان کو فرض کیا ہے اس پر وہ زیادہ تر درختوں پر رہتا تھا یا زمین پر، نہ ہم اس کی طرز معاشرت اور طریق بود و باش کی تفاصیل سے واقف ہیں، لیکن یہ تفاصیل اور اس کی عام عادات خواہ درختی ہوں یا غیر درختی، اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اسی قسم کی زندگی تھی جیسی کہ ہم نے متصور کی ہے یعنی اس قسم کی زندگی بھی جو ان جبلی ہیجانات کے تابع تھی، جو دیگر اعلیٰ دودھ پلانے والے جانوروں کے جبلی ہیجانات کے مشابہ تھے، ان دونوں کی طرز معاشرت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ مقدم الذکر (انسان) میں پیش بینی اور ربط و ضبط ہوتا ہے،[2]

بتدریج ارتقاء کی صورت یہ ہے:

اس کا تخیل کسی اور حیوان کے تخیل کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا کردار گذشتہ تجربات کے مطابق مستقبل کی زیادہ پیش بینی پر دلالت کرے گا، اور آئندہ واقعات و حادثات کی روک تھام اور اس کی تیاری کی

[1] اساس نفسیات باب ہفتم [2] ایضاً



غرض سے وہ اپنے فصل کی زیادہ دور رس اسکیم تیار کرے گا، نیز اسکیم پر عمل کرنے میں وہ اور اس کے ساتھی ایسا موثر و متنوع تعاون کریں گے کہ کوئی اور دودھ پلانے والا جانور نہیں کرسکتا ہے، اس میں حیوان کے بالمقابل تخیل کی اعلیٰ طاقت کا انکشاف اس طرح بھی ہوتا ہے کہ وہ زیادہ خود مختار ہوتا ہے، اپنے اعمال و افعال کو خود شروع کرسکتا ہے، اور اپنی کوششوں کو بہت لمبے عرصہ تک جاری کرسکتا ہے۔[1]

ابتدائی انسان کی اسی نفسیات کے پیش نظر پروفیسر جیمس نے کہا ہے

"انسان بس ایک تقلید کرنے والا حیوان ہے، اس کی ساری تعلیم پذیری بلکہ اس کی ساری تمدنی ترقی کا دارومدار اس کی اسی خصوصیت پر ہے۔"[2]

اور سی لائڈ مارگن نے کہا ہے

"انسان ایک قوی الفکر حیوان ہے، جو اپنے کردار کے نصب العین مقرر کرتا ہے۔"[3]

لیکن اگر انسان میں ایک اور توانائی کی "فعالیت" تسلیم کیجائے تو ابتدائی انسان کا نقشہ اس حد تک بدل جاتا ہے کہ "نیچرل کانسٹی ٹیوشن" ہی میں خصائص انسانی، خود شعوری کا وصف اور ذی شعور طاقت کی کارفرمائی لازمی بن جاتی ہے،

**تشکیل جدید میں ابتدائی انسان کا نفسیاتی مطالعہ**

تشکیل جدید میں ابتدائی انسان کی رونمائی حضرت آدمؑ سے ہوتی ہے اور زندگی کے ابتدائی واقعات و حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نفسیات میں وجود کے پہلے ہی دن سے یہ سب موجود تھے،

چنانچہ فرشتوں کو جب خصائص کے بارے میں شبہہ ہوا اور انھوں نے نیازمندانہ عرض کیا

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَ — کیا آپ اس کو نائب بنائیں گے جو

[1] اساس نفسیات باب ہفتم [2] پرنسپلز آف سائیکالوجی ج ۲ ص ۴۰۸ [3] مقدمہ نفسیات تقابلہ ص ۴۰۳

يَسْفِكُ الدِّمَاءَ[1] — زمین میں فساد و خونریزی کریگا،

تو فوراً جواب ملا

إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ[2] — جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے،

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انسان اور فرشتہ دونوں کا امتحان لیکر اس کا عملی تجربہ بھی کرا دیا گیا اور فرشتوں کو اعتراف کرنا پڑا،

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ[3] — خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے لیے ہیں، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے،

اس میں خود شعوری کا وصف و ذی شعور طاقت دونوں کی کار فرمائی ہے

اسی طرح ابتدائی ایام محض جبلی ہیجان و خواہش کے نذر نہیں ہوئے ہیں بلکہ آدمؑ میں خود شعوری اور ذی شعور طاقت کی کار فرمائی کی بنا پر خطاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے، نیز ان دنوں وہ تنہا نہ تھے بلکہ ان کی بیوی بھی تھیں،

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ[4] — ہم نے کہا کہ اے آدمؑ تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو

دونوں کو سب سے پہلے یہ حکم ملا تھا،

وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ[5] — تم اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں ہوگے.

اس حکم کے باوجود دونوں درخت کے پاس گئے، اس کے نتیجہ میں ان کا تن بدن کھل گیا جس کو ان کا شعور برداشت نہ کر سکا اور وہ اس کو فوراً ڈھانپنے کی تدبیریں کرنے لگے

[1] سورہ بقرہ رکوع ۴ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً



فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ[1] — جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان کے ستر کھل گئے اور جنت کے پتوں سے ستر ڈھانپنے لگے

خود شعوری اور ذی شعور قوت کا مظاہرہ اس طرح بھی ہوا کہ وہ عدول حکمی پر زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکے بلکہ عجز و نیازمندی کی گردن جھکا کر کہنے لگے،

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ[2] — پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائینگے اور ہمارے اوپر رحم نہ کرینگے تو ہمارے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے،

مغربی توجیہ میں مذہب ایجاد بندہ اور حیوانی جبلتوں کا پیدا کردہ ہے

نفسی ساخت کی مغربی توجیہ میں نیچرل کانسٹی ٹیوشن سے نہ مذہب کا کوئی تعلق ہے اور نہ اس کی ایجاد میں کسی مافوق الفطرت ہستی کو دخل ہے، بلکہ وہ ایجاد بندہ اور حیوانی جبلتوں کا پیدا کردہ ہے، چنانچہ اس کی ایجاد کی یہ صورت بیان کیجاتی ہے:

"انسان میں ابتداءً جب کچھ شعور پیدا ہوا تو اس نے اپنے گرد و پیش حیرت انگیز نظام اور خوفناک مظاہر کا مشاہدہ کیا، اس سے حیرت و خوف کے جذبات نمودار ہوئے، پھر لامحالہ انسان کو خوفناک اور ڈراؤنی چیزوں سے اپنے تحفظ کی فکر ہوئی، نیز سکون اور پناہ کے لیے کوئی راہ تلاش کرنی پڑی، بہت غور و فکر کے بعد یہ بات انسان کے سمجھ میں آئی کہ ان خوفناک اور ڈراؤنی چیزوں کو خوشامد و لجاجت سے راضی کیا جا سکتا ہے، یہیں سے پوجا پاٹ کی داغ بیل پڑی اور مختلف اشیاء کی پرستش شروع ہوگئی،

[1] سورہ اعراف رکوع ۲ [2] ایضاً

پھر جس قدر شعور میں ترقی اور ذہنی بلندی حاصل ہوتی گئی مظاہر فطرت کی نوعیت میں تبدیلی ہوتی رہی اور بالآخر انسان اپنے تحفظ کی راہ تلاش کرتے کرتے موجودہ مذہب تک پہنچا، اور ایک ایسے خدا کا قائل ہوگیا جو تمام طاقتوں کا خالق و مالک ہے [1]"

اس ایجاد کی اس صورت میں فطرت سے مذہب کے تعلق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، البتہ جبلت سے اس کا تعلق بیان کرنے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے:

"مذہبی جذبہ کا تعلق کسی ایک جذبہ کے ساتھ مشروط نہیں ہے بلکہ یہ چند جبلتوں کے آپس میں امتزاج و عمل کا نہایت پیچیدہ اور عجیب و غریب نتیجہ ہے۔

ابتدا میں یہ جبلتیں نہ مذہبی نوعیت کی تھیں اور نہ انسان کے لیے مخصوص تھیں بلکہ حیوان و انسان دونوں میں یکساں پائی جاتی تھیں، لیکن بتدریج ترقی سے ان میں تاثیر و تاثر کا عمل ظاہر ہوا ہے، جس کے نتیجہ میں مذہبی جذبہ نمودار ہو کر انسان کی جبلت میں داخل ہوگیا

یہ ان محققین کی تحقیق ہے جنھوں نے نظریۂ ارتقا میں ما بعد الطبیعیاتی عوامل کی کارفرمائی تسلیم کی ہے کیونکہ اس میں ادنی سے اعلیٰ کی طرف ارتقا ہے، اور سب سے اعلیٰ خدا ہے،

لیکن حقیقۃً اس نظریہ میں ما بعد الطبیعاتی عوامل کی کوئی حیثیت نہیں ہے جن کے بغیر مذہب انسانی توہمات و خیالات کا تراشیدہ اور خود خدا بھی ذہنی ارتقا کی ایجاد قرار پاتا ہے۔

تشکیل جدید میں مذہب کا تعلق نیچرل کانسٹی ٹیوشن سے ہے

تشکیل جدید میں مذہب کا تعلق "نیچرل کانسٹی ٹیوشن" سے ہے اور وہ فطرت کی آواز ہے جس کی نشو و نما میں ایک ذی شعور طاقت کی کارفرمائی ہے،

چنانچہ ابتدائی انسان کو جو ابتدائی ہدایتیں دی گئی تھیں وہ یہ ہیں:

(۱) مخالف طاقتوں (جبلی ہیجان و شیطان) سے ہوشیار رہنا

[1] معاشرتی نفسیات ص ۱۴۱



بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ [1] — تم میں بعض بعض کے دشمن ہیں

(۲) دنیا میں محض ایک مقررہ وقت تک زندگی گذارنا ہے،

وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ [2] — تم کو زمین میں چند دن ٹھہرنا ہے،

(۳) دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھانا

وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ [3] — ایک مقررہ وقت تک فائدہ اٹھانا ہے،

ان کے علاوہ بھی چند باتوں کی تعلیم دی گئی

فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ [4] — آدمؑ نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اس نے آدمؑ پر توجہ فرمائی،

یہ بات بھی ظاہر کردی گئی کہ ہدایتوں کا سلسلہ جاری رہیگا اور محکمۂ احتساب قائم ہوگا

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ — اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہمارے احکام کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہوں گے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(سورہ بقرہ رکوع ۴)

تحت الشعور کے مخفی تاروں تک رسائی کیلیے ایک ذی شعور طاقت کی دریافت ضروری ہے

در اصل تحت الشعور میں کچھ "تار" ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست ایک ذی شعور طاقت سے ہے، جب تک اس طاقت کی پہچان نہ ہوگی تاروں کے زیر و بم سمجھ میں نہ آئیں گے، اور نہ مذہب کی حقیقت تک رسائی ہو سکے گی،

[1] سورہ بقرہ رکوع ۴ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

مغربی تہذیب کے پاس ذی شعور طاقت نہیں ہے، اس لیے تحت الشعور کی ماہیت و نوعیت اس کی نظروں سے اوجھل رہی، اور ان "جالوں" کو تار سمجھ لیا گیا جو بعد میں تحت الشعور پر آگئے تھے، اور چار و ناچار ان ہی سے مذہب کا تعلق قائم کر دیا گیا، جیسا کہ درج ذیل تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے۔

فرائڈ نے نفس انسانی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) شعور اور (۲) تحت الشعور

(۱) شعور نفس انسانی کا وہ حصہ ہے جس کے ذریعہ انسان سوچنے سمجھنے اور تصرفات وغیرہ کے قابل بنتا ہے،

(۲) تحت الشعور وہ حصہ ہے جو شعور کے نیچے دبا رہتا ہے، اور انسان کے تمام خیالات و جذبات کا سرچشمہ بنتا ہے،

تحت الشعور کی تحقیق میں خوابوں، لغزشوں، ظرافتوں اور خاص طور پر عصبی اختلال کو بنیاد بنا دیا گیا ہے، یعنی ان چیزوں کی تحلیل سے معلوم ہوا ہے کہ تحت الشعور کی ماہیت و نوعیت میں جنسی خواہش کا جذبہ ہے۔[۱]

پھر مزید تحقیق کے بعد علم و فلسفہ اور اخلاق وغیرہ بھی ناقابل تسکین اور دبی ہوئی جنسی خواہشات کو چھپانے کا ذریعہ قرار پائے ہیں، یعنی جب انسان کی فطرت جنسی خواہش سے مطمئن نہیں ہوتی تو علم و فلسفہ اور اخلاق وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہونے پر مجبور ہوتی ہے،

اس تحقیق میں مذہب کی یہ توجیہ بیان کی گئی ہے:

(۱) بچہ بڑا ہونے کے بعد جب سمجھتا ہے کہ اب والدین اس کی حفاظت اور غور و پرداخت کرنے سے قاصر ہیں تو وہ ایک آسمانی باپ (خدا) کی خواہش پیدا کر لیتا ہے، اور پھر وہ باپ (خدا)

۱ جدت نفسیات باب پنجم



اصلی باپ کی جگہ حکم و احکام کا سلسلہ جاری کرتا ہے،

(۲) عام زندگی میں امن و سکون کی حالت اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے جب تک انسان اپنی خواہشات کو دوسروں کے لیے قربان نہ کرے اور یہ قربانی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انسان کے سامنے اس کا کوئی معاوضہ نہ ہو، لیکن دنیا میں حقیقی معاوضہ کی صورت بھی، اس لیے خدا کے نام سے خیالی معاوضہ کی ایک شکل تجویز کی گئی، پھر خیالی معاوضہ ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا مذہب کی موجودہ صورت کو پہنچا

اسکے بغیر کوئی دریافت قطعی اور مکمل نہیں ہے

لیکن تحت الشعور کی یہ دریافت قطعی اور مکمل نہیں ہے، چنانچہ میکڈوگل نے پرزور انداز میں اس کی تردید کی ہے۔[۱]

"سی جی یانگ" نے اس کو یک رخہ اور خام بتا کر مکمل کرنے کی کوشش کی ہے،[۲]

"ایڈلر" نے تحت الشعور میں جنسی خواہش کے بجائے غلبہ و اقتدار کی خواہش تجویز کی ہے،[۳]

اور خود فرائڈ کو بھی مجبوراً کئی مرتبہ کہنا پڑا کہ

"اس کا نظریہ پوری زندگی پر حاوی ہونے کا مدعی نہیں ہے، بلکہ خاص طور پر اس رخ کی تشریح کرنا چاہتا ہے جس کو دوسرے تمام نظریات میں تاریک چھوڑ دیا گیا ہے۔"[۴]

(باقی)

۱ اساس نفسیات ص ۵، ۵ ۲ جدت نفسیات، یانگ کی تحلیلی نفسیات ص ۱۷۶

۳ جدت نفسیات باب پنجم ۴ ایضاً ص ۱۴۸

# قرونِ وسطیٰ میں عرب و ہند کے سیاسی تعلقات

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب لکچرار الہ آباد یونیورسٹی

عرب و ہند کے تعلقات بہت قدیم بتائے جاتے ہیں، لیکن ابھی تک اس قدامت کی کوئی تحریری شہادت دستیاب نہیں ہوئی، قدیم ہندوستان کے ادب میں تو عربوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، البتہ عرب کے جاہلی ادب میں بعض ہندوستانی اشیاء کے حوالے ملتے ہیں، جیسے سیوف تلعیہ وغیرہ، ان یک طرفہ شہادتوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت اگر تھی تو محض تجارتی وہ بھی سطحی، بعثت اسلام سے قبل جنوبی مشرقی عرب کے ساحلی باشندے جہاز رانی کا پیشہ کیا کرتے تھے، اور ہند و چین اور مصر و روم کے درمیان تجارتی اموال کے حمل و نقل میں مصروف رہتے تھے، اسلیے ان کا علم صرف ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک محدود رہا ہوگا اور اس سلسلے کی کوئی سنی سنائی بات انکی اپنی زبان میں پہنچ گئی ہوگی،

ہندوستان اور عرب کے درمیان باقاعدہ سیاسی و ثقافتی روابط کا آغاز بعثت اسلام کے بعد سے ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ سیلون کے ایک راجہ نے جب بعثت نبویؐ کی خبر سنی تو تحقیق حال کے لیے اپنے یہاں کے ایک دانشمند کو بھیجا، یہ شخص مدینہ منورہ اُس وقت پہنچا جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا تھا، بلکہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی وفات پا چکے تھے، راجہ سیلون کا فرستادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملا، اور اسلام کے متعلق معلومات حاصل کر کے اپنے ملک کو واپس ہوا، یہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سادگی اور تواضع سے بہت زیادہ متاثر ہوا، مگر راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا، البتہ اس کا خادم سیلون پہنچا جہاں اس نے



صورتِ حال بیان کی،

لیکن باقاعدہ تعلقات کا آغاز ۱۵ھ سے ہوا ہے جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العاص الثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر بنا کر بھیجا، عثمان نے اپنے بھائی حکم کو بحرین کی طرف بھیجا، اور خود عمان پہنچکر ایک بحری بیڑہ ہندوستان کی جانب روانہ کیا، یہ بحری بیڑہ تھانہ پہنچا اور یہاں سے کامیاب واپس ہوا، اس کے بعد ایک اور مہم مغیرہ بن ابی العاص کی قیادت میں دیبل اور ایک تیسری مہم بھروچ پر حملہ آور ہوئی، اگرچہ یہ سب مہمیں کامیاب لوٹیں، لیکن جب خلیفہ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو وہ عثمان بن ابی العاص کی اس غیر دانشمندانہ جرأت سے بہت زیادہ برافروختہ ہوئے اور انھوں نے ایک نہایت تہدید آمیز خط لکھا،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس برافروختگی کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ وہ ایک غیر ملک میں جو دور دراز فاصلے پر واقع تھا مسلمانوں کو بھیجنا دانشمندانہ بات نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے عثمان کو جو خط لکھا تھا، اُس کے حسب ذیل الفاظ اس کے شاہد ہیں،

یا اخا ثقیف حملت دوداً علی عود وانی احلف باللہ لو اصیبوا لاخذت من قومک مثلھم (بلاذری)

اس ناپسندیدگی کی دو وجہیں اور معلوم ہوتی ہیں:

اولاً ہندوستان کی شوکت و عظمت عربوں کو اس سے مانع تھی کہ وہ اس کی طرف کسی دوسرے ارادے سے نظر بھی اٹھائیں، دوسرے جن ممالک سے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو یا پہنچے کا اندیشہ نہ ہو، ان پر حملہ اسلام کی سیاسی پالیسی کے خلاف تھا، مسلمانوں نے بالخصوص قرونِ اولیٰ میں صرف ان ہی ممالک و اقوام کے خلاف نبرد آزمائی کی جو کسی نہ کسی طرح انکے درپئے استیصال تھیں،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، انھوں نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی کو برقرار رکھا، لیکن جب رائے عامہ کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے گورنر عراق کو

لکھا کہ ایک واقف کار شخص کو حدود ہند کی طرف تحقیق حال کے لیے بھیجا جائے، جو آکر وہاں کی کیفیت بارگاہ خلافت میں پیش کرے، اس کام پر حکیم بن جبلہ العبدی مامور ہوئے، وہ صورت حال کی تحقیق کرکے مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ علاقہ بڑا خطرناک ہے، سامان خورد و نوش کی بے انتہا قلت ہے، اور لوگ دلیر ہیں، اس لیے اگر بڑا لشکر بھیجا گیا تو بھوکا مر جائیگا، اور اگر چھوٹا لشکر بھیجا گیا تو بڑی آسانی سے شکست کھا جائیگا، اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا، اور ستر سال کے لیے ہندوستان کی فتح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا،

لیکن اس اثنا میں حالات نے ایک نئی شکل اختیار کر لی اور عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان سیاسی آویزش ناگزیر ہوگئی، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اسلام کی بعثت مفاد پرست طبقہ کے لیے اعلان موت تھی، اس لیے وہ شروع سے اسکے استیصال کے درپے رہا، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب تمام قبائل عرب میں ارتداد کی وبا پھوٹی اور مدعیان نبوت نے بھی مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کیں تو ان کو عجم کی جاگیردارانہ نظام کی شہ حاصل تھی، یوں بھی دربار مدائن کا رویہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ صرف معاندانہ بلکہ گستاخانہ تھا، اس لیے مدبرین خلافت نے قبائل عرب کے فتنہ کو فرو کرنے کے بعد مصلحت اسی میں دیکھی کہ آئندہ کے لیے ان عجمی دسیسہ کاریوں کا سدباب کر دیا جائے،

لیکن جو مہمیں ایرانی سرحد کی جانب بھیجی گئیں، ان کے "روئیں دژ" کاغذی پتوں سے بھی زیادہ نکلے، یوں بھی عربوں کا حوصلہ ذی قار کی جنگ میں بڑھ چکا تھا، اس لیے ان ابتدائی فتوحات سے ان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی، ادھر ساسانی عظمت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور سارے ملک میں وہ انتشار و پراگندگی برپا تھی، جو زوال پذیر قوموں اور ملکوں میں پیدا ہو جایا کرتی ہے، اس لیے جلد ہی ہر معرکہ میں فتح و ظفر نے عربوں کے قدم چومے اور پورا ملک عجم عربوں کے زیر نگیں ہو گیا،



لیکن اس سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا، اب قلمرو خلافت کی مشرقی سرحد ہندوستان کے مغربی کنارے تک پہنچ گئی تھی، اس لیے سرحدی آویزشیں ناگزیر ہوگئیں، لیکن یہ کوئی بڑی اہم بات نہیں ہے، عموماً سرحدوں پر اس قسم کے واقعات اس عہد تنویر میں بھی ہوا کرتے ہیں، مگر ان جھڑپوں کے ایسے دوررس اثرات نہیں ہوتے کہ ملک کے سیاسی نقشے ان کی وجہ سے بدل جائیں یا تاریخی دھارے کا رخ ہی پلٹ جائے۔

مگر اس وقت صورت حال اس سے زیادہ سنجیدہ تھی، وہ علاقہ جس کا مغربی حصہ آج افغانستان اور مشرقی حصہ پاکستان کہلاتا ہے، ایران و ہند کے درمیان متنازع فیہ بنا ہوا تھا، ایرانیوں کے نقطۂ نظر سے یہ علاقہ داریوش الکبیر کی وسیع سلطنت میں داخل تھا، بالخصوص اس کا مشرقی حصہ تو اس کی بیسویں Starafsi کہلاتا تھا، آج کے بدلے ہوئے جغرافیائی حالات میں اس کے حدود کا تعین نہیں ہو سکتا، لیکن اس کی وسعت کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے، اس کا سالانہ خراج ۳۶۰ تالان تھا، جو دارا کے ایشیائی مقبوضات کے ایک ثلث کے برابر تھا۔

شاید سکندر نے بھی پنجاب کی فتح کے بعد اپنی عنان عزیمت اسی لیے موڑ دی تھی کہ اسے اپنے ملک اور قوم کے دیرینہ دشمن ہخامنشیوں سے جو انتقام لینا تھا، وہ فتح پنجاب کے بعد پورا ہو گیا، اس لیے بقیہ ممالک کی تسخیر سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی، گو افسانوی طور پر تو یہی مشہور ہے کہ سکندر مشرق و مغرب کی فتح کے ارادے سے نکلا تھا، بہر حال پنجاب سے سکندر کی واپسی اس سیاسی ورثہ کے مفروضہ کی تائید کرتی ہے کہ سکندر نے صرف اپنے ہی محروسہ عرض کو فتح کرنے پر قناعت کی جس پر اس کے حریف ہخامنشیوں کا قبضہ تھا، یا جس کے وہ قانونی طور سے مدعی تھے، غالباً اسی سیاسی ورثہ کے مفروضہ کے پیش نظر تیسری صدی مسیحی میں

اردشیر بابک نے پنجاب پر حملہ کیا اور بعد میں اس کے جانشینوں نے ہندوستان کے خلاف اپنی فاتحانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔

اردشیر کے حملہ ہندوستان کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے،

بعضے برآں اند کہ خواہرزادۂ فوراست وچوں برتخت حکومت برآمد افعال پسندیدہ و خصال برگزیدہ ظاہر گردانید و در معموری ملک کوشید و در کنار بحر گنگ وجمنا قریات و قصبات احداث فرمودہ در عدل و داد سعی بلیغ بجا آوردہ و بہ اردشیر بابکان معاصر بود وسالے کہ اردشیر قصہ تسخیر ہند نمودہ تا حوالی سرہند آمدہ جونہ مضطرب گشتہ بخدمت وے شتافت و دُر و زر وجواہر بسیار و پیلاں از دہا کردار پیش کش کردہ برگردانید" (تاریخ فرشتہ ص۱۰۱)

فرشتہ کا یہ بیان محض دلخوشکن افسانہ نہیں، بلکہ عین واقعہ ہے، چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسمتھ لکھتا ہے:

*The catagorical statement That a perfectly historical per sonage, Ardashir Papakan (Pabagan) invaded The Panjab advancing To The neigh bour hood of Sirhend (Sehrend, Sahrind) or to The Sutlaj, and Then retired when The Indian principal monarch did homage and paid tribute, does not read like mere legend similar events have occurred and The assertion as it stands, looks as if it had*



*been copied from some serious historical work now not available.* (J. R. A. S. 1920. P.222

(ترجمہ) یہ قطعی بیان کہ ایک مکمل تاریخی شخصیت اردشیر پاپاکان (پابگان) نے پنجاب پر حملہ کیا اور وہ سرہند (سہرند، سَہرند) کے قرب وجوار یا ستلج تک پہنچ گیا اور پھر واپس ہو گیا جبکہ ہندوستان کے خاص حکمراں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور خراج ادا کیا، یہ محض افسانہ نہیں معلوم ہوتا، اسی قسم کے واقعات ہوئے ہیں، اور یہ بیان جیسا کہ یہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی اہم تاریخی تصنیف سے نقل کیا گیا ہے، جو کہ اب دستیاب نہیں ہے،

اس کے علاوہ کشان خاندان جو اصل ایرانی لہجہ میں کوشان شاہ ہے، ساسانیوں کے زمانے میں اس علاقے کا مالک تھا، اور یہ خاندان شاہی نسل ہی سے تعلق رکھتا تھا، لیکن ساسانی عہد کے آخر میں یہاں کے قبائلی علاقے مرکزی گرفت سے نکل گئے اور ان علاقوں پر دربار مدائن کا قبضہ گومگو کی حالت میں رہا، مگر حوصلہ مندان سیاست کبھی بھی اپنے قانونی حق سے دستبردار نہیں ہوئے، اور یہی قانونی استحقاق ساسانیوں کے جانشینوں (عربوں) کے ورثہ میں آیا، اس لیے انھوں نے تسخیر عجم کی تکمیل کے لیے ان سرحدوں کو بھی عبور کرنے کی کوشش کی، چنانچہ حسب تصریح بلاذری ۳۹ھ میں حارث بن مرۃ العبدی نے ارض قیقان (قلات) پر حملہ کیا جو ہندوستان کی سرحد پر واقع تھا، اور اگرچہ مرکز خلافت سے مدد نہ ملنے کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد اپنے ساتھیوں سمیت شہید کر دیا گیا، مگر اس سیاسی ورثہ کا مفروضہ عرب فاتحین کے دماغ سے نہ نکل سکا، چنانچہ ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ حملہ کرکے بنّو اور لاہور تک پہنچ گیا، بنّو کی فتح آج بھی عربی ادب میں یادگار ہے، ایک شاعر کہتا ہے:

الم تران الازد لیلۃ بیّتوا ببنہ کانوا خیر جیش المہلّب

یہ تو عربوں کا دعویٰ تھا لیکن اہل ہند کا دعویٰ بھی اس سے کمزور نہیں تھا، پنجاب کا علاقہ داریوش الکبیر کی سلطنت میں رہا ہو، اس کا کوئی ذکر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ہے، البتہ جب سکندر کی واپسی کے بعد مینانڈر نے اس کے ہندوستانی مقبوضات کی بازیابی کے لیے حملہ کیا تو چندرگپت نے نہایت پامردی سے اس کا مقابلہ کیا اور شکست فاش دی، اس وقت یونانی حملہ آور کے خود اپنے شامی اور مصری مقبوضات معرض خطر میں تھے، اس لیے اس نے چندرگپت کی پیش کردہ شرائط پر صلح کر لی جس کے نتیجے میں نہ صرف پنجاب بلکہ وہ علاقہ بھی جو آج افغانستان اور وسط ایشیا کہلاتا ہے، چندرگپت کے قبضہ میں آگیا، بعد میں جب اشوک اعظم موریہ سلطنت کا وارث ہوا اور اس نے بودھ مذہب اور ثقافت کی ترویج و اشاعت کی کوشش کی تو یہ علاقہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن گیا، حتیٰ کہ برہمنیت کے عروج کے بعد جب بودھ مذہب اپنے تابعین اولین میں اجنبی بن گیا اُس وقت بھی یہ علاقہ بودھ مذہب کا مرکز بنا رہا، اور اس کے آثار نہ صرف مشرقی علاقے (بامیان وغیرہ) میں پائے جاتے ہیں، بلکہ اقصائے مغرب و شمال بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ بلخ جو آگے چل کر قبۃ الاسلام کہلایا، بودھ مذہب کا بہت بڑا مرکز تھا، جہاں کا نو وہار تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس سے زیادہ اس معبد کے متولی کا خاندان، جو برمک کہلاتا تھا، کیونکہ اسی کے خلاف مشرف باسلام ہونے کے بعد عباسی تاریخ میں برامکہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

لیکن جب تک پنجاب و سندھ میں معمولی راجے حکمراں رہے، اس سیاسی ورثہ کے مفروضہ نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی، البتہ جب راجہ داہر سندھ کا حکمراں ہوا تو وہ بڑا بیدار مغز، مدبر اور حوصلہ مند تھا، اور اس کو سیاست سے بڑا شغف تھا،

اس وقت اسلامی دنیا کی حالت بھی بڑی دگرگوں ہو رہی تھی، خلافت راشدہ کا زمانہ



میں ختم ہو چکا تھا، اس کے بعد ملک عضوض نے ان کی جگہ لے لی تھی، عرب یوں بھی حریت پسند اور ملوکیت بیزار تھے، اسلام کی تعلیمات اور ان سے زیادہ امویوں کے جبر و استبداد نے ان کو اموی حکومت سے بیزار کر دیا، لیکن بانی خاندان امیر معاویہؓ نے اپنے تدبر و سیاست سے مخالف طاقتوں کو ابھرنے نہ دیا، یزید کے زمانہ میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ ہائلہ پیش آیا، لیکن چونکہ اس کا عہد حکومت بہت مختصر تھا، اس لیے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لیے زندہ نہ رہ سکا، اس کے جانشین معاویہ نے عافیت اسی میں دیکھی کہ

شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہ دلکش است اما بہ درد سر نمی ارزد

اس لیے وہ منصب خلافت سے دست بردار ہو گیا، اس کے بعد مروان اور پھر عبدالملک اس عظیم الشان سلطنت کے سربراہ ہوئے، عبدالملک خود بڑا سخت گیر تھا، جو کمی رہ گئی تھی وہ حجاج نے پوری کر دی، جس سے عام بدحالی پھیل گئی اور ابن اشعث کی بغاوت کی شکل اختیار کر لی، مگر غیر مطمئن اکثریت کی قیادت کسی خوش تدبیر قائد کے ہاتھ میں نہ تھی اس لیے کامیاب نہ ہو سکی، مگر اس ناکامی سے اصل فتنے کا استیصال نہیں ہو سکا، اور ایک عام بیزاری پوری قلمرو اسلامی میں باقی رہی۔

راجہ داہر جیسا بیدار مغز حکمراں ان بین الاقوامی حالات سے کس طرح بیخبر اور غافل رہ سکتا تھا، وہ امویوں کی اس غیر مقبولیت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا منتظر تھا، حجاج کی دار و گیر اور سخت گیر شمشیر نے باغیوں کو چن چن کر قتل کر ڈالا، مگر اس کے باوجود اموی بیزار عناصر میں کمی نہ ہوئی، ان ہی میں علافی خاندان بھی تھا جس نے جا کر راجہ داہر کے یہاں پناہ لی، راجہ داہر اس مہرے کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتا تھا، اس کے ذریعہ عرب امپریلزم کو شہ مات دینا چاہتا تھا۔

حجاج اپنی سخت گیری اور ظلم و تشدد کے باوجود معاملے کی نزاکت سے غافل نہ تھا، اس نے چند بار داہر سے اس خاندان کی واپسی کے لیے درخواست کی جب اس میں ناکام ہوا تو عبدالملک کو

اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا، مگر اس کو حریف کی طاقت کا اندازہ تھا، اس لیے فی الحال الجھنا نہیں چاہتا تھا، اور کچھ دنوں تک یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ اس مہم میں جو مصارف ہوں گے ان کی تلافی ریگستان سندھ کے مال غنیمت سے نہ ہوسکے گی۔

لیکن اس درمیان میں ایک اور واقعہ پیش آگیا جو تھا تو بہت معمولی مگر اس نے امویوں کے روایتی تدبر سے بڑی سنجیدہ شکل اختیار کرلی، سیلون کے راجہ نے کچھ متوفی مسلمان تاجروں کی لڑکیوں کو خلیفۂ اسلام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حجاج کے پاس بھیجا، مکران کے جہاز کو بحری قزاقوں نے جنھیں مید کہتے تھے اور جنھیں راجہ داہر کی پشت پناہی حاصل تھی، پکڑلیا، کہا جاتا ہے کہ ان عورتوں میں ایک عورت قبیلہ بنی یربوع کی تھی جو حجاج کی دہائی دے بیٹھی، جب اس کی خبر حجاج کو پہنچی تو اس نے برجستہ یا لبیک کہا، اور راجہ داہر کو خواتین کی واپسی کے لیے لکھا، اس نے کوئی توجہ نہ کی اور حجاج کو ایک ٹالنے والا جواب لکھ دیا کہ یہ قزاق میرے بس سے باہر ہیں، اسلیے میں انھیں کس طرح مجبور کرسکتا ہوں

حجاج بھی یہی چاہتا تھا، اس نے اس واقعہ کو قومی غیرت کا مسئلہ بنا کر خلیفہ ولید بن عبدالملک کے سامنے پیش کیا، اس لیے اس کو راجہ داہر سے فیصلہ کن جنگ کی اجازت دینی پڑی، اور چونکہ معاملہ قومی غیرت و حمیت کا تھا، اس لیے پورا ملک کچھ دن کے لیے حجاج کے مظالم کو بھول گیا اور اس مہم میں شرکت کے لیے آمادہ ہوگیا، حجاج نے پہلے عبید اللہ بن نبہان کی سرکردگی میں اور پھر زیادہ سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی زیر قیادت ایک فوج بھیجی، ابتدائی گفت و شنید ناکام رہی اور دوبدو جنگ کی نوبت آگئی، راجہ داہر نے اپنی مدد کے لیے علاقائی لوگوں کو بلایا مگر وہ علانیہ مقابلے میں آنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے میدان جنگ میں جانے سے معذرت کرلی، البتہ جنگی چالیں بتاتے رہنے کا وعدہ کرلیا، مگر نہ ان کی چالیں آنے والی تباہی کو روک سکیں اور نہ نوجوان راجہ کی عظمت و شوکت اور اس کا حسن تدبر روک سکا، راجہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا کام آیا، سندھ



عربوں کے قبضے میں آگیا، اور توقع سے زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا، اس موقعہ پر جو مختصر فتحنامہ حجاج نے بھیجا تھا، وہ بڑا معنی خیز تھا، اس نے لکھا تھا:

| | |
|---|---|
| شفینا غیظنا وادرکنا ثارنا وازددنا | ہمارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا، ہم نے اپنا بدلہ لے لیا، |
| ستین الف الف درھم ورأس | ساٹھ کروڑ درہم سے زیادہ نقد اور راجہ |
| داھر (بلاذری ص ۴۴۵) | کا سر ملا، |

یہ طنز تھا عبدالملک کی اس بہانہ سازی پر کہ اس مہم میں جو مصارف ہوں گے اس کی تلافی ریگستان سندھ کے مال غنیمت سے نہ ہوسکے گی۔

سندھ کی فتح کے ساتھ ہندوستان میں عرب حکومت کا آغاز ہوتا ہے، یہ واقعہ ۹۳ھ کا ہے، دو سال کے عرصہ میں ملحقہ علاقہ مع ملتان کے فتح ہوگیا اور برصغیر کا شمالی مغربی علاقہ خلافت اسلامیہ کا ایک صوبہ بن گیا، جہاں دربار خلافت سے باقاعدہ گورنر مقرر ہوکر آنے لگے۔

پہلا فوجی گورنر محمد بن قاسم تھا مگر اسکے اگلے سال ۹۶ھ میں ولید نے وفات پائی، اسکا جانشین سلیمان بن عبدالملک حجاج اور اس کے خاندان سے کینہ رکھتا تھا، اس لیے اس نے محمد بن قاسم کو معزول کرکے واسط کے قید خانہ میں ڈلوا دیا، اسی موقع پر اس نے اپنا یہ دردناک شعر کہا تھا،

اضاعونی وای فتی اضاعوا — لیوم کریھۃ وسداد ثغر

محمد بن قاسم کے بعد اموی دور خلافت میں جو گورنر بھیجے گئے ان کے نام بالترتیب یہ ہیں:

یزید بن ابی کبشۃ السکسکی، عامر بن عبداللہ، حبیب بن مہلب، عمرو بن مسلم الباہلی، جنید بن عبدالرحمن المری، تمیم بن زید القینی، حکم بن عوانۃ الکلبی، عمرو بن محمد بن قاسم اور یزید بن عرار، لیکن چونکہ محمد بن قاسم کے یہ جانشین کچھ زیادہ لائق نہ تھے، اس لیے عرب فتوحات کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

۱۱۰ھ تک سندھ اور ملتان کا ایک ہی گورنر ہوتا تھا، مگر بعد میں سندھ کی بالادستی سے آزاد

ہوگیا اور وہاں بنو سامہ یا بنو منبہ کی خاندانی حکومت قائم ہوئی، جو غالباً ۴۱۶ھ تک باقی رہی، البتہ سندھ میں برابر دربارِ خلافت سے گورنر مقرر ہو کر آتے رہے،

۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے، ان کا عہد خلافت منہاج النبوۃ کا آخری نمونہ تھا، مگر وہ ۲ دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے، ان کے بعد اموی خلافت کا زوال شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ وہ تمام مفاسد پیدا ہوگئے جو انحطاط کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ تباہ کن امویوں کی عصبیت تھی جس سے خود مصری اور یمنی عربوں میں پھوٹ پڑگئی اور ان میں خانہ جنگی برپا ہوگئی، دوسری طرف ہاشمیوں اور عباسیوں کی تحریک عرصے چل رہی تھی، ایرانیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور عباسیوں نے ابو مسلم خراسانی کی مدد سے ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کا خاتمہ کردیا،

اب سندھ بھی عباسی خلافت کا ایک صوبہ بن گیا، اموی عہد کے آخر میں منصور بن جمہور اس علاقہ پر متغلب ہوگیا تھا، ابو مسلم نے مغلس العبدی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، مگر منصور نے اسے قتل کردیا، ابو مسلم کو خبر ہوئی، تو اس نے خلیفہ اول سفاح کی اجازت سے ایک مشہور مدبر موسیٰ بن کعب تمیمی کو افسر فوج بنا کر بھیجا، اس نے منصور کی فوج کو شکست فاش دی اور سندھ کے تمام علاقوں پر بڑی خوبی سے حکمرانی کی، غالباً ۱۴۰ھ میں اپنے بیٹے عیینہ کو اپنا قائم مقام بنا کر موسیٰ سندھ سے لوٹ آیا، اس کی وفات کے بعد عیینہ کو سندھ کا مستقل گورنر بنا دیا گیا، مگر وہ لائق باپ کا بیٹا نہ نکلا، اس کی بدانتظامی سے خود مسلمان آپس میں لڑ پڑے، اس کا دماغ یہاں تک پھر گیا کہ مرکزی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا، اور اس کے احکام کی تعمیل بند کردی، اس سے خلیفہ منصور نے عمر بن حفص بن عثمان کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، اس کی شجاعت اس قدر مشہور تھی کہ لوگ اس کو ہزار مرد کہتے تھے، اس نے عیینہ بن موسیٰ کو گرفتار کرکے خلیفہ کے پاس پایۂ تخت بھیج دیا،

اسی عہد میں سندھ میں شیعیت کی ابتدا ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص عبداللہ الاشتر علوی



اپنے چند جان نثاروں کے ساتھ کچھ عمدہ گھوڑے خرید کر سندھ پہنچا اور لوگوں پر ظاہر کیا کہ وہ گھوڑوں کے تاجر ہیں، لیکن ان کا اصل مقصد بنو عباس کے خلاف اہل بیت کی خلافت کی تبلیغ تھی، عمر بن حفص خود اہل بیت کا حامی تھا، اس لیے ان کی دعوت بڑی خوشی سے قبول کرلی اور شہر کے بڑے بڑے صاحبِ اثر لوگوں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا، اور یہ طے پایا کہ ایک دن جمعرات کو بیعت لی جائے لیکن خلیفہ منصور کو عبداللہ الاشتر کے حالات معلوم ہوگئے تھے، اس نے عمر بن حفص کے نام ایک فرمان بھیجکر جواب طلب کیا، عمر نے عبداللہ الاشتر کو ملحقہ علاقہ کے ایک راجہ کے پاس بھیج دیا، جہاں وہ اطمینان سے رہنے لگا، عمر کے ایک وفادار ساتھی نے اپنے کو پیش کیا کہ عبداللہ الاشتر کی جگہ اسکو بھیجدیا جائے، چنانچہ عمر نے اس کو منصور کے پاس بھیجدیا، اس نے عبداللہ الاشتر سمجھکر اسکو قتل کرادیا، یہ واقعہ ۱۵۱ھ کا ہے، اس کے باوجود منصور کا دل عمر بن حفص کی طرف سے صاف نہ ہوا، مگر وہ اس کی قابلیت سے واقف تھا، اس لیے اسی سال سندھ سے واپس بلا کر افریقہ کا گورنر مقرر کردیا،

اس کے بعد سندھ میں امن و امان قائم ہوجانا چاہیے تھا، لیکن عالم اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی نزاری اور یمانی نزاع نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی، اسلیے جو گورنر بھی بھیجا گیا ناکام رہا، ان گورنروں کے نام بالترتیب حسب ذیل ہیں: ہشام بن عمرو تغلبی، معبد بن خلیل تمیمی، روح بن تمیم، بسطام بن عمرو، نصر بن محمد بن اشعث خزاعی، محمد بن سلیمان ہاشمی، زبیر بن عباس، مصبح بن عمر تغلبی، نصر بن محمد، لیث بن طریف، سالم یونسی، اسحٰق بن سلیمان ہاشمی، یوسف بن اسحاق ہاشمی، طیفور بن عبداللہ حمیری، جابر بن اشعث طائی، سعید بن سلیم بن قتیبہ، عیسیٰ بن جعفر بن منصور عباسی، عبدالرحمٰن، ایوب بن جعفر بن سلیمان، داؤد بن یزید بن حاتم، بشیر بن داؤد مہلبی، موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی، عمران بن موسیٰ، عنبسہ اسحٰق ضبی اور ہارون بن ابی خالد جس کا انتقال ۲۴۰ھ میں ہوا،

آخر متوکل باللہ نے مجبور ہو کر ایک مقامی امیر عمر بن عبد العزیز ہباری کو یہاں کا نیم خود مختار حاکم تسلیم کر لیا، یعقوبی لکھتا ہے:

| | |
|---|---|
| وتوفی ھارون بن ابی خالد | ہارون بن ابی خالد عامل سندھ کا ۲۴۰ھ |
| عامل السند سنة ۲۴۰ وکتب عمر | میں انتقال ہو گیا تو عمر بن عبد العزیز سامی |
| بن عبد العزیز السامی المنتمی | صاحب بلد نے جو سامہ بن لوی کی جانب |
| الی سامہ بن لؤی صاحب البلد | منسوب ہے، متوکل کو لکھا کہ اگر اس کو شہر کا |
| ھناک یذکر انہ ان ولی البلد | والی بنا دیا جائے تو وہ اس کا پورا انتظام |
| قام بہ وضبطہ فاجابہ الی | کرے گا، متوکل نے منظور کر لیا اور |
| ذلک فاقام طول ایام المتوکل | اس کے پورے دور تک وہ والی رہا |

(تاریخ یعقوبی جزء ثالث ص ۲۱۵)

اس طرح ہندوستان میں ایک نیم خود مختار عرب حکومت قائم ہوئی جس کے حکمران خطبہ تو عباسیوں ہی کا پڑھتے تھے اور انھیں ایک رقم بھی بطور خراج ادا کرتے تھے لیکن اندرونی معاملات میں آزاد تھے، یہ حکومت ۳۶۷ھ تک قائم تھی، چنانچہ ابن حوقل جس نے اسی سال سندھ کی سیاحت کی تھی، یہاں کے سیاسی حالات کے بارے میں لکھتا ہے:

| | |
|---|---|
| ملکھا (یعنی المنصورة) من قریش | منصورہ پر ہبار بن اسود قریشی کی اولاد |
| من ولد ھبار بن الاسود قد | میں سے ایک شخص حاکم ہو گیا، جس کے |
| تغلب علیھا اجدادہ وساسوھا | اجداد نے اس پر قبضہ کر کے یہاں اس تدبیر سے |
| سیاسة اوجبت رغبة الرعیة | حکمرانی کی تھی، کہ رعایا اس کی جانب مائل |
| فیھم وایثارھم علی من سواھم | ہو گئی تھی، اور ان کو دوسروں پر ترجیح دیتی |



| | |
|---|---|
| غیر ان الخطبة لبنی العباس | تھی لیکن خطبہ بنی عباس کا پڑھا جاتا تھا، |

(ابن حوقل صورة الارض ص ۳۲۰)

بلکہ ۳۷۵ھ کے بعد بھی سندھ میں یہی حکومت تھی، اسی سال مقدسی یہاں آیا تھا، اور وہ یہاں کی سیاسی صورت حال کے بارے میں لکھتا ہے:-

| | |
|---|---|
| واما المنصورة فعلیھا سلطان | منصورہ پر ایک قریشی سلطان حکمراں ہے، |
| من قریش یخطب للعباسی | جو عباسیوں کا خطبہ پڑھتا ہے |

(احسن التقاسیم ص ۴۸۱)

ملتان میں بھی ۳۶۷ھ تک بنو منبہ (بنو سامہ) کا خاندان حکمراں تھا، جو عباسیوں ہی کا خطبہ پڑھتا تھا، جیسا کہ ابن حوقل نے لکھا ہے:-

| | |
|---|---|
| وھو من ولد سامة بن لؤی | ملتان کا حکمراں سامہ بن لوی بن غالب |
| بن غالب ولیس ھو فی طاعة | کی نسل سے ہے، جو کسی کے ماتحت |
| احد وخطبتہ لبنی العباس | نہیں ہے، البتہ بنو عباس کا خطبہ |
| (ابن حوقل ص ۳۲۲) | پڑھتا ہے، |

(باقی)

---

## تاریخ اسلام جلد سوم

دو صدیوں یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ابو اسحٰق متقی للہ ۳۳۲ھ / ۹۴۴ء تک عباسیوں کی سیاسی تاریخ، ضخامت ۴۷۲ صفحے، قیمت ۸۰ روپے، مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

منیجر

# شیخ علی بخش بیمارؔ

## (ایک مطالعہ)

از ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب ایم اے پی ایچ ڈی

آنولہ بریلی روہیلکھنڈ کی ایک قدیم بستی ہے، یہ روہیلوں کے دورِ عروج میں ان کی حکومت کا صدر مقام بھی رہا، نواب علی محمد خاں کی وفات (۱۴ ستمبر ۱۷۴۹ء) کے بعد نواب حافظ رحمت خاں نے انتظام سلطنت سنبھالا، ان کے عہد میں ۱۷۵۴ء تک آنولہ کی مرکزی حیثیت قائم رہی، انھوں نے ۱۷۵۴ء میں بریلی کو دار السلطنت قرار دیا، اور آنولہ سے بریلی منتقل ہوگئے، اور آنولہ اور اس کے ملحقہ قصبات سردار خاں اور علی محمد خاں کے لڑکوں کے تصرف میں دیدیے گئے، نواب محمد یار خاں امیر ابن نواب علی محمد خاں نے موضع ٹانڈہ (آنولہ) میں محفل سخن آراستہ کی، ان کے درباری شاعروں میں قائم چاندپوری اور مصحفی جیسے اساتذۂ فن شامل تھے، آنولہ کی ادبی حیثیت ۱۷۷۴ء تک قائم رہی، اسی سال نواب ضابطہ خاں کو مرہٹوں کے مقابلہ میں بمقام سکرتال ہزیمت اٹھانا پڑی اور اس افراتفری کے عالم میں جس کا جس طرف کو منہ اٹھا بھاگ نکلا اور آنولہ خالی ہوگیا، قائم چاندپوری رامپور پہنچے اور مصحفی لکھنؤ۔

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو — بن بن کے کھیل ایسے اکثر بگڑ چکے ہیں

شیخ علی بخش بیمار اسی اجڑے دیار میں جنگ سکرتال کے ۱۹ سال بعد ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے، ان کے خاندانی حالات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں، میرا خیال ہے کہ ان کے بزرگ نوابین روہیلہ کے زمانہ میں



سنبھل یا بدایوں سے ترک وطن کرکے آنولہ میں آباد ہوگئے تھے، بیمار کی پیدائش آنولہ میں ہوئی جس پر بیشتر تذکرہ نگار متفق ہیں، ان تذکرہ نگاروں میں امیر مینائی، جارج فانتون اور سید نور الحسن خاں بھی شامل ہیں، امیر مینائی تو دربار رامپور سے متعلق تھے، ان کی تالیف انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ) بیمار کی وفات کے عرصہ ۱۹ سال بعد تحریر میں آئی، رامپور کی سکونت کی وجہ سے ان کے وسائلِ معلومات وسیع اور معتمد تھے، انھوں نے بیمار کو متوطن شہر بانس بریلی لکھا ہے، سید نور الحسن خاں کا فرمانا قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں: "از خاک پاک آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی است"۔

شیخ علی بخش بیمار سن شعور کو پہنچنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے، جہاں جعفر علی حسرت اور میر و مرزا کی وفات کے بعد مصحفی کا طوطی بول رہا تھا، بیمار ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے، بیمار کے اساتذہ کے سلسلے میں قدرت اللہ شوق اور مومن کے نام بھی لیے گئے ہیں، جو ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہیں، شوق رامپور میں مقیم تھے، ان کا انتقال ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ہوا، اس وقت بیمار کی عمر بیس سال تھی اور وہ لکھنؤ میں تھے، بیمار کا ۱۸۴۰ء سے پہلے رامپور پہنچنا ثابت نہیں ہوتا، اس کے علاوہ رامپور پہنچنے کے بعد بیمار مصلحتاً اخون زادہ احمد خاں غفلت رامپوری تلمیذ قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہوئے، اگر بیمار شوق کے شاگرد ہوتے تو انھیں بربنائے مصلحت غفلت کی شاگردی اختیار نہیں کرنی پڑتی، اب رہا مومن سے شاگردی کا مسئلہ تو مومن ایک بار سہسوان ضرور آئے تھے، مگر اس آمد سے یہ ثبوت فراہم نہیں ہوتا کہ بیمار ان کے شاگرد بھی ہوئے، کسی تذکرے سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی کہ بیمار نے شوق یا مومن کی شاگردی اختیار کی، اس لیے بیمار کا لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں مصحفی کا شاگرد ہونا ہر شبہہ سے بالاتر ہے،

شیخ علی بخش بیمار ۱۸۴۰ء میں رامپور تشریف لے گئے، نواب سید محمد سعید خاں ڈپٹی کلکٹر سہسوان رامپور کے تخت پر ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو متمکن ہوئے، نواب صاحب کے حکیم سعادت علی خاں رئیس آنولہ سے خصوصی تعلقات تھے، اس لیے انھوں نے تخت نشینی کے بعد حکیم صاحب کو رامپور بلا کر

افواج ریاست کا جنرل مقرر کردیا، بیمار اور حکیم صاحب کے درمیان ہموطنی کی بنا پر ملاقات تھی، چنانچہ حکیم صاحب نے بیمار کو رامپور بلاکر دربار میں باریاب کرادیا،

شیخ علی بخش بیمار نے ۱۸۴۰ء میں بعمر ۵۳ سال اخون زادہ احمد خاں غفلت رامپوری کے شاگرد ہوئے، اس سلسلے میں امیر مینائی نے لکھا ہے: "جب اس دار الریاست میں آکر سرکار کے ملازموں میں داخل ہوئے یہاں احمد خاں غفلت کا دور دورہ تھا، مصلحتاً ان کے شاگردوں میں داخل ہوئے"،

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیمار کی ترقی غفلت کی توجہ کی محتاج تھی، ممکن ہے یہ بات صحیح ہو مگر ذہن قبول نہیں کرتا، بیمار تو حکیم سعادت علی خاں کی دعوت پر رامپور گئے تھے، ان کی موجودگی میں کسی اور سہارے کی کیا ضرورت تھی، میرے خیال میں بیمار کو مترجم کی حیثیت سے غفلت کی توجہ درکار تھی، اسی مصلحت کے پیش نظر وہ غفلت کے شاگرد ہوئے، غفلت صرف شاعر ہی نہیں تھے، انھیں داستان طرازی کا بھی تجربہ تھا، اور وہ بزمانۂ نواب سید احمد علی خاں رام اور سیتا کا قصہ (۱۸۲۵ء) پیش کرچکے تھے، اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ بیمار نے بوستان خیال کا ترجمہ کرتے وقت غفلت کے تجربے سے فائدہ حاصل کیا ہو،

اخون زادہ احمد خاں غفلت کی وفات ۱۸۴۳ء میں ہوئی، اس طرح بیمار اور غفلت کا تعلق تین سال تک رہا،

بیمار کی دو تصنیفات یعنی طلسم بیضا اور دیوان بیمار رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں،

**طلسم بیضا** تذکرہ نگاروں اور مضمون نگاروں نے طلسم بیضا سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، مثلاً حنیف نقوی رقمطراز ہیں:

بیمار جب رامپور پہنچے تو وہاں انھیں بوستان خیال کے نظم کرنے کی خدمت تفویض ہوئی، یہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے افسانۂ مذکور کی کوئی جلد نظم کی یا نہیں، مگر وہ تقریباً دس سال تک



اسی خدمت پر مامور رہے، اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ کچھ جلدیں ضرور نظم کی ہوں گی، اس قیاس کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ رضا لائبریری رامپور میں ان کے کلام کا جو مجموعہ محفوظ ہے وہ بہت مختصر اور نامکمل ہے، جابجا ردیفوں کے لیے سادہ ورق چھوٹے ہوئے ہیں، ایسے دور میں جب کہ غزل ہمارے ادب پر چھائی ہوئی تھی، اور روز و شب شاعروں کی محفلیں جمی رہتی تھیں، ان اوراق کا سادہ رہ جانا اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ بیمار ضرور کسی دوسرے کام میں منہمک رہے ہوں گے جس کی وجہ سے وہ روش عام کے مطابق اپنے دیوان غزلیات کی ردیف وار تکمیل نہ کرسکے، یہ کام بوستان خیال کا نظم کرنا ہی ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں قادر بخش صابر صاحب تو صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ کوئی جلد بوستان خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب اردو میں نظم کرتا تھا، معلوم نہیں اختتام کو پہنچا یا نہیں، لیکن لالہ سری رام کا بیان ہے کہ بوستان خیال کے کچھ حصوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا، بہرحال نہ تو اس ترجمے کی کوئی جلد شائع ہوئی اور نہ اب ان قلمی مسودات ہی کا کہیں پتہ چلتا ہے، اگر اس نظم کی تکمیل و اشاعت ہو جاتی تو یہ بیمار کا ایک گرانقدر کارنامہ ہوتا، ان کے باقیات میں اس وقت طلسم بیضا کے نام سے ایک قدیم طرز کی داستان ہے اور ایک مختصر سا دیوان غزلیات محفوظ ہے"۔

یہ تحریر گمراہ کن ہے، بیمار نے بوستان خیال کا منظوم ترجمہ نہیں کیا اور طلسم بیضا ایک قدیم طرز کی طبع زاد داستان نہیں ہے، طلسم بیضا بوستان خیال کا منثور ترجمہ ہے، بیمار تیرہ چودہ برس اس ترجمے میں منہمک رہے ہے، حنیف نقوی صاحب نے یا تو طلسم بیضا کا مطالعہ نہیں کیا یا وہ بوستان خیال سے ناواقف ہیں، بیمار نے طلسم بیضا کے مقدمے میں لکھا ہے:۔

حمد جناب کبریا، نعت خاتم الانبیا، منقبت سید الاوصیہ، ثنائے خیر النسا، توصیف آل طٰہٰ، تعریف صحابہ اتقیا کی ایسی نہیں کہ ادا ہوسکے، ناچار حرف مدعا بیان کیا جاتا ہے، ہرچند یہ خاکسار

علی بخش بیمار اتنی لیاقت نہ رکھتا تھا کہ عبارت فارسی کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے اہل زبان سے داد خوش بیانی کی لیتا، لیکن بجالانا حکم آقائے نامدار، وحید روزگار، نواب محمد سعید خاں بہادر دام اقبالہٗ کا کہ صانع قدرت نے حکمت کاملہ اپنی سے عناصر اربعہ کو فراست اور شجاعت اور عدالت اور سخاوت سے ترتیب دیکر چار طاق اقبال میں اس کے جسم مبارک کا طلسم باندھا ہے، فرض عین جان کر لکھنے ترجمہ طلسم بیضا کہیں کہ خلاصہ کتاب بستان خیال کا ہے مصروف ہوا، فصیحان معجز نگار سے امید وار ہوں کہ غلطی محاورات سے چشم پوشی فرما کر معاف رکھیں۔"

اس تحریر کے بعد اس میں کسی شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ طلسم بیضا بوستان خیال کا اردو منثور ترجمہ ہے، بوستان خیال میں طلسمات کی دنیا آباد ہے، پانچ طلسم بڑے ہیں، (۱) طلسم اجرام و اجسام (۲) طلسم سبع سباع (۳) طلسم بیضا (۴) طلسم حکیم اشراق (۵) طلسم حیرت کدہ آصفی، طلسم بیضا کے علاوہ چار طلسمات کا ترجمہ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی نے ۱۸۴۲ء - ۱۸۵۵ء کے زمانے میں کیا، خورشید نامہ جو بوستان خیال میں بجائے خود ایک ضخیم داستان ہے، ترجمہ کی گئی، طلسم سبع سباع اور طلسم بیضا خورشید نامہ کا غالب حصہ ہیں، خورشید نامہ کا ترجمہ مرزا کاظم حسین عرف مرزا جھنو اور عبداللہ خاں داستان گو نے ۱۸۶۳ء میں کیا، بوستان خیال کا ترجمہ ۱۸۶۴ء میں ہوا، یہ تمام قلمی نوادر نواب محمد سعید خاں کے عہد حکومت کی یادگار ہے۔

بیمار کے ترجمہ طلسم بیضا کا نسخہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے، یہ مخطوطہ پچپن جزو اور پانچ اوراق پر مشتمل ہے، اس کو کئی کاتبوں نے نقل کیا ہے، ایک کاتب کا نام احمد علی معلوم ہوتا ہے، نسخے کی نقل بیمار کی وفات کے تین ماہ بعد پانزدہم شہر جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ مطابق ۴ مارچ ۱۸۵۵ء کو تمام ہوئی،

بیمار نے طلسم بیضا کے ترجمے میں با محاورہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے، اساتذۂ قدیم کے اتباع میں عبارت آرائی کا شوق پورا کرنے کے لیے ادق اور نامانوس الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال نہیں کیا ہے،



البتہ کبھی کبھی مقفی عبارت لکھتے ہیں، اور ان کے جملوں کا ربط، عبارت کا ارتقا، اور داستان کی فضا، اساتذۂ سلف کی یاد تازہ کر دیتی ہے، طلسم بیضا کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عبارت عام فہم ہے، داستان پڑھنے کے بعد ترجمہ کا احساس نہیں ہوتا، بیمار کا یہ کارنامہ ان کی ادبی دسعت کا حامل ہے، طلسم بیضا کی عبارت کا نمونہ مندرجہ ذیل ہے:

"جب معز الدین نے حکیم ابو المحاسن کو خورشید نامہ کی لوح پڑھنے کے واسطے عنایت کی تو اس نے تھوڑی دیر مطالعہ کر کے فصاحت اور بلاغت سے پڑھنا شروع کیا کہ ملک مغرب حضرت اسحق علیہ السلام کی اولاد سے سیف الدولہ نام ایک بادشاہ تھا، خزانہ اس کا شمار سے باہر، فوج لشکر سلیمان کے برابر، عدل میں نوشیرواں، اس کا غلام سخاوت سے ہر ایک آسودہ کیا، خاص کیا عام ہر شہر اور قصبہ اور گاؤں میں عیش و نشاط کا چرچا، تمام ولایت میں رنج عنقا، مگر چراغ سلطنت کہ بیٹے سے عبارت ہے نہ رکھتا تھا، جب اس کا سن شریف ساٹھ کو پہنچا اور داڑھی میں سفیدی آئی، تخت سلطنت کو چھوڑ کر گوشۂ عزلت اختیار فرمایا، ہر چند ارکان دولت نے عرض کیا کہ تقدیر الٰہی سے بیزار ہو کر بادشاہی سے دست بردار ہونا مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کہ دشمن یہ خبر سنکر فساد اٹھا دیں اور ملک موروثی ہاتھ سے جاتا رہے، لیکن نصیحت نے کچھ فائدہ نہ کیا، ناچار سب امیر مایوس ہو کر رخصت ہوئے، اور وزیر باتدبیر کہ روشن ضمیر نام رکھتا تھا اور سات پشت سے وزارت کا منصب اس کے خاندان میں تھا، اس غم سے ایسا گھل گیا کہ بدن میں سوا پوست استخواں کے کچھ باقی نہ رہا۔"

دیوان بیمار: یہ خود مؤلف کا نسخہ ہے، متعدد صفحات ۱۵۶ ہیں، بعض صفحات کورے ہیں، بعض صفحات پر چند شعر ہیں، بعض غزلیں نا تمام ہیں، دو ایک پر صرف مقطع ہے، اس کے باوجود دیوان میں ترتیب اور سلیقہ ہے، امیر مینائی نے لکھا تھا "کلام بہت تھا مگر تلف ہو گیا،" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل دیوان ضائع ہو جانے کے بعد بیمار نے اپنی یادداشت کے سہارے زیر نظر دیوان مرتب کیا، اور جو مکمل غزل یاد رہی وہ سالم نقل کر دی اور

جس کا صرف مقطع یاد تھا اس کو اس امید پر نقل کر کے چھوڑ دیا کہ باقی اشعار جب یاد آئینگے تو نقل کر دیے جائیں گے، یا اس زمین میں دوبارہ غزل لکھکر شامل دیوان کر لیجائیگی، کیونکہ شعرا کے دیوان ایسے نامکمل نہیں ہوتے، مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ مخطوطۂ رامپور ان کے ضائع شدہ دیوان کی ناتمام نقل ہے،

دیوان میں غزلیات کے علاوہ دو خمسے، ایک ناتمام قصیدہ اور چھ رباعیات بھی ہیں، پہلا خمسہ نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، یہ مصرع "دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی" فارسی میں ہے، دوسرا خمسہ رشتار امپوری کی غزل" ہاں وہ فرماتے ہیں اک بار تو سو بار نہیں" پر اردو میں ہے

ناتمام قصیدہ کا یہ مطلع ہے:

دم سحر جو در یار سے کھلی زنجیر　　تو باریاب ہوا میں بھی یہ سنی تقریر

دیوان بیمارؔ اصل میں دیوان غزلیات ہے، اس لیے ہم صرف بیمارؔ کے معیار غزلگوئی پر گفتگو کر سکتے ہیں،

بریلی کی تقریباً سوا دو سو سالہ شعری تاریخ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اٹھارہویں صدی پر ختم ہونے والا دور اردو غزل میں نہ صرف ادبیت کا حامل تھا، بلکہ شعریت، وجدانیت اور جاذبیت سے بھی معمور تھا، مثلاً محبت خاں محبتؔ کی غزل میں ادبی وقار کے ساتھ داخلی کیفیات کی اثر انگیزی اور طرز بیان کی دلکشی بھی ہے، البتہ روہیلکھنڈ کی تباہی کے بعد جب شعرائے بریلی پر لکھنؤ کے اثرات قائم ہوئے تو بتدریج کیفیاتی شاعری رخصت ہو گئی، اس تبدیلی کی ابتدا امیر غلام علی عشرتؔ سے ہوتی ہے، ان کی غزل میں زن بازاری کی خارجی دلکشی ملتی ہے، چونکہ یہ تبدیلی ابتدائی مرحلے میں تھی، اس لیے عشرتؔ کی نظر انگیا کی بلندی و پستی پر نہیں پڑی اور ان کا تغزل گیسوئے خم بخم سے آگے نہیں بڑھا، ان کے بعد کے اساتذۂ بریلی تکلف و تصنع میں غرق ہو گئے، ان کی غزلیات میں ایسے اشعار بھی ہیں ؎



پشت لب اسکے سبزے ہوئے اب بھلا ہوا　　باغ امید بوسہ ہمارا ہرا ہوا

غسل میں رخ پہ پڑی آ کے جو مہ کی کاکل　　عکس سے دیکھ پڑا صاف گہن پانی میں
(دعبد الملک ممتازؔ)

میری وحشت سے سر دست گریزاں وحشی　　مچھلیاں دشت میں پھرتی ہیں ہرن پانی میں
(دلدار رشاد لیقیؔ)

لکھا ہو گر اس کا وصف لب پان خوردہ　　خامہ جو ہنوز اپنا لہو میں نہاتا ہے

بنام نہوں کیونکر آزادؔ یہ فرمائو　　نامہ کا وہ پنجا لا تکل میں لگاتا ہے
(دانیر الدین آزادؔ)

بیمارؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا دور غزل کے فطری رجحانات سے وابستہ تھا، قیام لکھنؤ کے زمانے میں انھوں نے خارجی شاعری کو غزل میں راہ دی، مگر ان کی غزل میں بگاڑ کی صورت اتنی پیدا نہیں ہوئی جس کا نمونہ مندرجۂ بالا اشعار ہیں، ان کی مضمون بندی نہ تو معما بنی اور نہ توصیف معشوق کمر موہوم تک پہنچی، انتخاب زمین بھی گوارا ہے، الفاظ ادبی بھرم کے پانوں پر استادہ ہیں، حدیث وصل کے بجائے احساس و آرزوئے وصل اور تذکرۂ بوسۂ لب و دہاں کے بجائے بوسہ لب و دہاں کی ہلکی مٹھاس ملتی ہے ان کی لکھنوی غزلوں میں اپنے مرکز سے دور ہونے کے باوجود ادبی سلیقہ ہے، ان میں برگ گل کی نزاکت نہ سہی عظمت سرو قدی ضرور ہے ؎

تصور بندھ گیا دل پہ سواد زلف جاناں کا　　قیامت پہ سحر ہونا رہا اب شام ہجراں کا

پھیرتے رہتے ہو کیوں دزد حنا کے سر پہ ہاتھ　　بندہ پرور دل ہمارا آپ پکڑا گیا

سنی پھبتی گل بادام کی جب چشم میگوں پر　　قلم نرگس ہوئے کرنے کو صاد اس تازہ مضموں پر

سیاہی سرخی رنگ حنا میں ہو گئی پیدا　　شگون نیک ہے باندھو کمر عاشق کے شبخوں پر

یہ عرس قیس ہے صحرا میں جو کثرت ہے جگنو کی　　گماں سرو چراغاں کا ہے ہر ایک بید مجنوں پر

طول سے لپٹی ہے انکی زلف پیچاں پانوں میں　　بیڑیاں پہنے ہے گویا ماہ کنعاں پانوں میں

کچھ بھی ہے سر پانوں یارب ظالموں کے ظلم کا　　ملتے ہیں جائے حنا خون شہیداں پانوں میں

سر پرستی سے جنوں کی ہاتھ اٹھائیں گے نہ ہم — گر پڑیں چھالے، چبھیں خارِ مغیلاں پاؤں میں

کوئے جاناں میں نہ جا برپا ہے ہنگامہ وہاں — مفت پس جائے گا اے بیمار ناداں پاؤں میں

کیوں نہ آلودہ ہوں صافی دل ہنر در خاک میں — آئینہ جوہر چھپا لیتا ہے مل کر خاک میں

واہ رے تاثیر تیرے عشقِ عالم سوز کی — خاصۂ اکسیر کا پیدا ہوا ہر خاک میں

مرگِ مجنوں میں جو لیلیٰ نے بچھایا بوریا — بن گیا بعد مجنوں نقشِ بستر خاک میں

روحِ بلبل کر گئی پرواز آتے ہی خزاں — کچھ ہوا میں اڑتے ہیں کچھ مل گئے پر خاک میں

جب شاعر میں شعر کی فکری عظمت کا شعور پیدا ہوتا ہے تو اس کے کلام میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے جس کے نمونے بیمار کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

تا آسماں پہنچ کے ہوئی آہ سرنگوں — یارب ہو خیر فوجِ الم کا نشاں گرا

بھولی جو ایک دم کو گریباں دری ہمیں — وحشت نے یاد دامنِ صحرا دلا دیا

قربان جائیے ترے شوقِ ظہور کے — دے کر فریب خاک میں ہم کو ملا دیا

وہ بارہا مرے رونے پہ ہنستے آئے ہیں — معاملہ ہے بہم برق و ابرِ تر کا سا

چشمِ جاناں پر گماں گذرا ہے مجھے دو صاد کا — قامتِ موزوں ہے یا مصرع کسی استاد کا

کون پرساں ہو حالِ بسمل کا — خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

کام آیا نہ خطِ پیشانی — کیا نمونہ تھا نقشِ باطل کا

داغِ دل بعد مرگ بھی نہ گیا — ساتھ توشہ تھا پہلی منزل کا

جانکنی عاشقی سے آساں ہو — کام مشکل ہے کاوشِ دل کا

مردنی پھر گئی مرے منہ پر — رنگ بدلا نہ ان کی محفل کا

لبِ جو کون سیر کو آیا — موج منہ جو بنی ہو ساحل کا



سانس آہستہ لیجو بیمار — ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

اس دور کے مخصوص طرزِ غزلگوئی کے اعتبار سے یہ اشعار شاعر کی فکری عظمت کا ثبوت ہیں اور بت گری اور اصنام پرستی کے اس دور میں شیشہ گری کی بھی عمدہ مثال ہیں۔

دیوان کے مطالعہ سے بیمار کی شاعری کے دور متعین نہیں کیے جا سکتے، یہ خیال غلط ہے کہ لکھنؤ کے زمانہ قیام میں انھوں نے صرف خارجی شاعری سے سروکار رکھا اور آہستہ آہستہ ان کے اپنے رنگ کے نقوش مدہم ہو گئے، فطری شاعری میں ترک و اختیار کو دخل نہیں ہوتا، البتہ زندگی کے حادثات و واقعات اس کے دل پر نئے نئے نقش بناتے رہتے ہیں، اور اس کی تمام زندگی "تہذیبِ مسلسل" کا نمونہ بن جاتی ہے، تہذیبِ مسلسل کے عمل میں ارمانوں کی پسپائی، تمناؤں کی شکست، نامرادی ضروری ہیں، درحقیقت بامراد شاعری نامرادی ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

آنکھ نیچی ہو گئی چپکے ہی دم دیتے بنی — موت مانگی دل نے فرقت میں تو جی ٹھہر گیا

یارے سوزِ جگر کا ہم گلہ کرنے کو تھے — رہ گئی عزت کہ دل میں درد پیدا ہو گیا

اے اجل شامِ ہجر آ پہنچی — اب تجھے انتظار ہے کس کا

شام سے تا صبح فرقت صبح سے تا شام ہجر — ہم چلے کیا کیا نہ لطفِ زندگانی دیکھ کر

رنج دنیا میں بہت پاتے ہیں ہم — اس محلے سے اٹھے جاتے ہیں ہم

بیمار اور اس کے سوا کچھ نہیں خبر — اچھا ہوا ہوں حادثۂ ناگہاں کے ساتھ

کیا سفر کا ارادہ جو بزمِ جاناں سے — کوئی گلے نہ ملا موت کے سوا مجھ سے

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے — کیا دردِ دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے

جنت میں حیاتِ ابدی کیا خاک ملے گی — دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں آنسو — کیے غم نے خالی مکاں کیسے کیسے

موت سے بھاگنے لگے بیمار
کیا اسے تم شکستہ پا سمجھے

ہزار سینے میں سرخ چھالے جگر میں کتنے ہیں داغ کالے
رواں کیے آنسوؤں نے نالے یہ حال یارا نہ ہو کسی کا

نہ بنا تا جو دن جدائی کا
کیا بگڑتا تری خدائی کا

بیمار کی غزل میں شوخی بھی ملتی ہے مگر بہت کم، یہ خیال بھی درست نہیں کہ انھوں نے جرأت کے رنگ میں غزلیں لکھیں، ان کا تجربہ جرأت سے زیادہ گہرا تھا، ان کی غزل کے معیار اور اس کی شعری و ادبی حیثیت کو جرأت کی غزل سے کوئی نسبت نہیں ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جس کسی نے دل دیا انکو چھپے چوری دیا
ایک میں کمبخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا

ہائے رے شوخی کہ آپہنچا جو وہ گھر تک مرے
پھر گیا درباں سے یہ کہکر کہ دھوکہ ہو گیا

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز
بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں

جب پوچھتا ہوں کس نے مرا دل چرا لیا
کہتے ہیں وہ بچائے خدا اتہام سے

وہ سن کر حال میرا کچھ نہ بولے
مگر ہر بات پر گردن ہلا کی

بیمار مسکینوں کے جنازہ ہے دوش پر
جاتے ہیں گھر خدا کے بڑے اہتمام سے

بندہ پرور کو ہے کیوں ملنے سے بیمار کے عار
ذی لیاقت بھی ہے دانا بھی ہے مشہور بھی ہے

کل تھے رندی کے مجتہد بیمار
آج دعویٰ ہے پارسائی کا

وہ رند ہوں جو روٹھ کے میخانے سے اٹھا
پاؤں پہ ہاتھ باندھ کے پیر مغاں گرا

بیمار کے دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد جو اشعار مزید انتخاب میں آئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

اللہ رے اضطراب اسیرانِ دام کا
صیاد جو ہر پشہ کے دل کو ہلا دیا

بھولی جو ایک دم کو گریباں دری مجھے
وحشت نے یاد دامنِ صحرا دلا دیا

بیمار اہل زر کو بجرأت نہ دیکھیے
نامرد تھے وہ جن کو فلک نے طلا دیا



نصیب ہم کو ملا سنگ رہگذر کا سا
کہ ٹھوکروں میں رہا سر کا عمر بھر کا سا

وہاں ہے چاند سے مکھڑے پہ زلف کا سایہ
سیاہ داغ جگر میں یہاں قمر کا سا

جو لکھا اللہ نے تقدیر میں اچھا لکھا
اس کے گھر انصاف ہے ہندو کو رکیا بیدکا

مختصر ہے مگر لکھا نہ گیا
حال طول شب جدائی کا

درد تعظیم مرگ کو دل میں
شب فرقت ہزار بار اٹھا

وحشت دل نے بھی نکالے پاؤں
پھر تحمل کا اختیار اٹھا

بدلی نہ وہ نگاہ زمانہ بدل گیا
تیر قضا وہی ہے نشانہ بدل گیا

نہ کہو اعتبار ہے کس کا
بیوفائی شعار ہے کس کا

آپ سا سب کو وہ سمجھتے ہیں
معتبر انکسار ہے کس کا

ہر روز وہ پھر جاتے ہیں در تک مرے آ کر
کچھ جذب محبت کو لگی ہے نظر ایسی

کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار
کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

آپ سے دور آپ خفا تھے جب تک
جان کی خیر مناتے گذری

یاد آ کے شب وصل ترے ہجر کے صدمے
کمبخت مجھے آنکھ لگانے نہیں دیتے

حال دل بیمار نہیں ضبط کے قابل
لیکن وہ زباں مجھکو ہلانے نہیں دیتے

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے
کیا درد دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے

کعبہ سمجھ لیا ہے مگر کوئے یار کو
بے اعتنائی جانتے ہیں پارسا مجھے

او بدگماں کہاں ہیں کہاں محفل نشاط
بزم عزا میں بھی نہیں ملتی ہے جا مجھے

کہتا ہوں اضطراب میں یادشمن سے حالِ دل
اپنا مآل کار نہیں سوجھتا مجھے

فتنہ جو کچھ اٹھے ترے اغماض سے اٹھے
اے دوست دشمنوں سے بھلا کیا گلہ مجھے

ان اشعار میں حسن معنی بھی ہے اور حسن بیان بھی، ادبی پختگی کے ساتھ شعریت بھی ہے۔ اور وجدان بھی، مختصر یہ کہ جرات، مصحفی اور ناسخ کے عہد میں بیمار کی غزلیات اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، سید علی حسن خاں لکھتے ہیں:

"علو خیالش بالاتر از گمان است قوت بیان ولطف زبان ادا گر از میر و مصحفی بیش نیست اینم نتوان گفت کہ کمتر است ہاں تقدم زمانے وتجدد زمانے چیزے دیگر است"۔

ہمارے خیال میں یہ رائے صداقت پر مبنی ہے،


**کتابیات:** حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۳ء

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| انتخاب یادگار | از | امیر مینائی | مطبوعہ تاج المطابع رام پور | ۱۲۹۰ھ |
| تذکرہ طور کلیم | از | نور الحسن خاں | مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ | ۱۲۹۸ھ |
| تذکرہ بزم سخن | از | علی حسن خاں | ،، ،، | ۱۸۸۱ء |
| تذکرۂ ہندی | از | غلام ہمدانی مصحفی | مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد | ۱۹۳۳ء |
| ریاض الفصحا | از | ،، ،، | مطبوعہ ،، | ۱۹۳۴ء |
| سخن شعرا | از | عبد الغفور نساخ | مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ | ۱۸۷۴ء |
| گلستان سخن | از | مرزا قادر بخش صابر دہلوی | مطبوعہ ،، ،، | ۱۸۸۲ء |
| تذکرہ شعرائے رامپور | از | حافظ فنون | قلمی رضا لائبریری رامپور | |
| اردو کی نثری داستانیں | از | ڈاکٹر گیان چند | مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی | ۱۹۵۴ء |
| طلسم بیضا | از | شیخ علی بخش بیمار | قلمی رضا لائبریری رامپور | |
| دیوان بیمار | از | ،، ،، | قلمی ،، ،، | |
| شیخ علی بخش بیمار | از | حنیف نقوی | مطبوعہ ماہنامہ نیا دور، شعبہ نشر و اشاعت حکومت اتر پردیش لکھنؤ جولائی | ۱۹۶۳ء |




# آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس

## کا

## ۲۳ واں اجلاس

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

اس سال آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا ۲۳ واں اجلاس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۲۷، ۲۸، ۲۹ اکتوبر کو منعقد ہوا، اس کا جلسہ ہر دوسرے سال ہوا کرتا ہے اور عام طور سے کوئی نہ کوئی یونیورسٹی میزبان ہوتی ہے، اس سال مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے میزبانی کا حق ادا کیا، اجلاس شروع ہونے سے پہلے مسلم یونیورسٹی کی مجلس استقبالیہ کے ارکین متردد اور پریشان تھے کہ اس اہم اجلاس کے اخراجات کے لیے جتنی رقم چاہیے تھی اُن کے پاس نہ تھی، معلوم ہوا کہ اس کے اخراجات کے لیے حکومت کی طرف سے امداد ملتی ہے، لیکن اس مرتبہ مسلم یونیورسٹی کو بہت ہی قلیل رقم ملی، اس لیے مجلس استقبالیہ کی طرف سے یہ طے کیا گیا کہ کانفرنس کے نمایندوں سے تین روز کے کھانے کے اخراجات پندرہ روپے لیے جائیں، جو ابتک نہیں لیے جاتے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی کی مجلس استقبالیہ کو یہ رقم اپنی مجبوریوں کی بنا پر لینی پڑی جس کے لیے اس کے ارکین کو افسوس کے ساتھ معذرت بھی کرنی پڑی، اس مالی پریشانی کے باوجود اجلاس ختم ہوا، تو تمام نمایندے خوش تھے کہ اُن کے قیام وطعام کا انتظام ہر طرح عمدہ اور قابل تعریف تھا، گو مجلس استقبالیہ کے ارکین یہ بھی کہتے رہے کہ وہ اپنے حوصلوں کے مطابق میزبانی کے فرائض انجام نہ دے سکے، اورنٹیل کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے جب اپنی الوداعی تقریر میں

شکریہ ادا کیا تو بڑی فراخدلی کے ساتھ کہا کہ گوشت خوروں اور سبزی کھانے والوں دونوں کے کھانے کا انتظام انتہائی درجہ کا عمدہ Absolutely excellent تھا، یونیورسٹی کی طرف سے طعام و قیام کے انتظام کی جو کمیٹی بنی تھی، اس کے صدر پروفیسر خلیق احمد نظامی (شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی) تھے۔ ان کی تعریف کرتے ہوئے اورینٹیل کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ مہمانوں کی خاطرداری کے لیے ہر موقع پر ہر وقت دکھائی دیے، پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے ہندوستان اور اس کے باہر ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکے ہیں، آگے چل کر یونیورسٹی اپنے جن علم دوست اور علم نواز اساتذہ پر فخر و ناز کرے گی اُن میں پروفیسر نظامی کا بھی نام ہوگا۔ ان کی انتظامی صلاحیت کا حال معلوم نہ تھا، خدا کرے اُن کا یہ وصف بھی اچھی طرح ابھرے، تاکہ وہ اپنی یونیورسٹی کے لیے ہر حیثیت سے مفید ہوں۔ ان کے معاون ڈاکٹر منیب الرحمٰن (شعبۂ اسلامیات) تھے،

اورینٹیل کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے اپنی الوداعی تقریر میں یہ بھی کہا کہ اس سال کے اجلاس میں جو نئی بات تھی، وہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی طرف سے عصرانہ تھا، اورینٹیل کانفرنس کی پوری تاریخ میں کسی یونیورسٹی کے طلبہ نے اجلاس کے پورے نمایندوں کو اس گرم جوشی سے مدعو نہیں کیا، تین پر تکلف عصرانے ہوئے، ایک یونیورسٹی کے چانسلر نواب صاحب چھتاری، دوسرا وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ اور تیسرا مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی طرف سے، نواب صاحب چھتاری کو ۳۳ سال پہلے یونیورسٹی کے احاطہ میں یو۔ پی کے گورنر کی حیثیت سے دیکھا تھا، اُس وقت اُن کے چہرے بشرے پر انکی زندگی کی رعنائیوں اور توانائیوں کی بہار تھی، اورینٹیل کانفرنس کے ایٹ ہوم کے موقع پر وہ اپنی عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے نظر آئے، وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ بھی ایٹ ہوم میں مہمانوں سے فرداً فرداً ملتے رہے،



مسلم یونیورسٹی کے اور دوسرے اساتذہ جو مختلف تقریبات میں پیش پیش رہے، اُن میں ڈاکٹر سوریا کانت (شعبۂ سنسکرت)، ڈاکٹر نور الحسن (شعبۂ تاریخ) پروفیسر آل احمد سرور (شعبۂ اردو) ڈاکٹر عبد العلیم (شعبۂ اسلامیات) مولانا سعید احمد اکبرآبادی (شعبۂ دینیات) ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (شعبۂ اسلامیات) پروفیسر ظفر احمد صدیقی (شعبۂ فلسفہ) ڈاکٹر عشرت انور (شعبۂ فلسفہ) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (شعبۂ اردو) اور ڈاکٹر امجد علی (شعبۂ اسلامیات) تھے، اس سال اردو کا شعبہ بھی تھا، اسکی کامیابی زیادہ تر پروفیسر آل احمد سرور کی دلچسپی اور سرگرمی کی وجہ سے ہوئی۔

اورینٹیل کانفرنس کا پہلا اجلاس کینیڈی ہال میں ہوا، جو مسلم یونیورسٹی کی عمارتوں میں ایک شاندار اضافہ ہے، خدا کرے اس کی روایتوں میں بھی اسٹریچی ہال ہی کی گوناگوں روایتوں کی کیفیت پیدا ہوتی رہے، اس ہال میں تقریباً پانچ سو نمایندے جمع تھے، جن میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور بودھ مت کے ماننے والے سب ہی تھے، اس کے خوبصورت ڈائس پر اتر پردیش کے گورنر، مسلم یونیورسٹی کے چانسلر، وائس چانسلر، اورینٹیل کانفرنس کے صدر، جنرل سکریٹری اور مختلف شعبوں کے صدر بیٹھے نظر آئے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنا خطبہ پڑھا جس میں یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں کی اُن خدمات کا ذکر خاص طور پر کیا، جو انھوں نے مشرقی علوم کے لیے کیے، پھر اس سلسلہ میں یونیورسٹی کی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا تھا، یہ خطبہ مختصر لیکن پُر مغز تھا، افسوس کہ یہ چھپا ہوا نہ تھا، اس لیے نمایندوں میں تقسیم نہیں ہو سکا، پھر اتر پردیش کے گورنر نے افتتاحیہ خطبہ پڑھا، یہ بھی چھپا ہوا نہ تھا،

اس کے بعد شیواجی یونیورسٹی کولھاپور کے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر اے۔ ان۔ اپادھیا نے اپنا خطبہ پڑھا، جو بہت ہی کاوش اور محنت کے ساتھ لکھا گیا تھا،

ہندوستان کے مختلف علمی کارناموں کو سراہتے ہوئے ایک جگہ اپنے اس دکھ کا بھی اظہار کیا ہے کہ آزادی کے بعد علاقائی زبان، تاریخ اور کلچر کو اتنی اہمیت دی جارہی ہے کہ ڈر ہے کہیں پورے ہندوستان کا نقشہ نظر سے اوجھل نہ ہوجائے، اسی کے ساتھ اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی کے نصاب میں ملک کے پرانے تمدن سے بہت کم دلچسپی لی جارہی ہے اور سنسکرت کو وہ اہمیت نہیں دی جارہی ہے جس کی وہ مستحق ہے، حالانکہ اسی زبان نے جدید زبانوں کو متمول کیا ہے، اسی نے خیالات اور ذخیرۂ الفاظ دیے ہیں، اس سے کم اہمیت پراکرت کو دی جارہی ہے، جس کے مطالعہ کے بغیر انڈو ایرین نسل کی جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی سمجھی نہیں جاسکتی ہے،

آزادی کے بعد ملک میں اخلاقی اقدار کا جو نقدان ہوگیا ہے، لائق صدر نے اسکی طرف بھی توجہ دلائی، فرمایا:

"اس افسوس کا اظہار ہر طرف کیا جارہا ہے کہ معاشرے میں اخلاقی نیکیاں اس حد تک عمل میں نہیں لائی جارہی ہیں، جتنی کہ لانی چاہیے، ملک کی آزادی کے بعد اس کا تجربہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے، ذاتی اور پبلک زندگی میں فرق پیدا کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں، اس کا زیادہ خیال اس وقت تک نہیں کیا جاتا ہے، جب تک وہ باضابطہ تحریر یا قانون کی گرفت میں نہ آئے، اوپر سے نیچے تک اخلاقی ضمیر کا گلا گھونٹا جارہا ہے"،

لائق صدر نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس سیکولر نظام حکومت میں مذہبی تعلیم نہیں دی جارہی ہے، اس لیے انھوں نے زور دیا کہ ان نوجوانوں کو مہابھارت، نیتی ساتکا، کیوڈل، نالدیار وغیرہ جیسی مذہبی کتابوں کے اقتباسات اور ان کے ترجمے پڑھائے جائیں، لائق صدر نے کہا کہ ملک کے دستور نے انجیل کی حیثیت اختیار کرلی ہے، لیکن ان کے خیال میں کوئی کتاب قومی صحیفہ بن سکتی ہے تو



وہ ترکیورل ہے، لائق صدر کو اس قسم کے مشورے اپنے اُن حاضرین اور مخاطبین کے لیے بھی دینا چاہیے تھا، جن کی مذہبی کتابیں کچھ اور ہیں،

فاضل صدر نے انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی، شملہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی طرف سے دراوڈی زبان، ہندوستانی فلسفہ، ہندوستان کی قدیم تاریخ اور کلچر، ادویتا اور فلسفہ شنکر لٹریچر کے لیے جو مراکز انامالائی، بنارس، کلکتہ، مدراس اور پونا میں قائم ہوئے ہیں، پھر سنٹرل سنسکرت انسٹیٹیوٹ، ترس پاتی، بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پونا اور دوسرے اداروں کے علمی کارناموں کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے، اگر وہ اورینٹل کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ہندوستان میں عربی، فارسی اور اسلامیات پر جو کام ہو رہا ہے اُس کا بھی ذکر خیر کردیتے تو بیرونی ممالک کے مستشرقین کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوتی کہ ہندوستان میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جارہا ہے،

لائق صدر نے بہار کی حکومت کو مبارکباد دی ہے کہ اس کی طرف سے وہاں پالی، سنسکرت اور پراکرت کے تین ادارے نالندہ، دربھنگہ اور ویشالی میں قائم ہوگئے ہیں، لیکن بہار کی حکومت کی طرف سے پٹنہ میں عربک اور پرشین ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم ہے اور وہ قابل قدر علمی کام انجام دے رہا ہے، فاضل صدر کو اس کے لیے بھی حکومت بہار کو مبارکباد دینا چاہیے تھا، اسی طرح صدر محترم جہاں سنسکرت، اپ بھرنش، پراکرت، پالی، مراٹھی، کنڑی اور جنوبی ہند کی دوسری زبانوں کا ذکر خیر کرتے ہوئے اُن کی ترقی کے خواہاں ہوئے ہیں، اور ان زبانوں کے مخطوطات کی اشاعت و طباعت کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد مشورے دیے ہیں، وہاں اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات اور ان کے مخطوطات کے متعلق بھی کچھ مشورے دیدیتے تو یہ اُن کی علمی اور ثقافتی فراخدلی کا مزید ثبوت ہوتا، سیلون کی حکومت کی طرف سے بدھ ازم کی جو انسائیکلوپیڈیا تیار ہو رہی ہے، اُس پر اپنے اطمینان کا اظہا

کیا ہے، بھنڈارکر اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے مہا بھارت کا جو ہندی اڈیشن شائع ہوا ہے اُس کو قومی مسرت کا سبب بتایا ہے، بھرت ناٹن، اتھروید، رگ وید، سام وید، مہا بھاشیا، اردھا گدھی وغیرہ پر جہاں جہاں کام ہو رہا ہے، اُس کی تفصیل لکھی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کی تدوین و تعلیم کے سلسلہ میں صدر نے بہت ہی اچھی بات یہ کہی کہ تاریخ کے سیاہ دھبوں پر انگلیاں رکھنے سے اب کوئی فائدہ نہیں، تاریخ کا مطالعہ اب اس حیثیت سے ہونا چاہیے کہ پورے معاشرے پر کیا کیا اثرات مترتب ہوتے گئے، انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ تاریخ لکھتے وقت طبقاتی مفاد، اپنی پسند کے نظریے اور ذاتی تعصبات کو سامنے رکھنے سے تحقیقات کے فن اور معیار کو نیچے کرنا ہے، مختلف یونیورسٹیوں میں پی، ایچ، ڈی اور ڈی لٹ کے جو مقالے لکھے جا رہے ہیں، اُن پر بھی صدر نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، انھوں نے کہا کہ پی، ایچ، ڈی کے مقالے لکھوا کر یونیورسٹی کے پرانے دستاویز کے دفتر کی خاک کے ڈھیر میں جمع کر دینا کوئی خدمت نہیں، اسی طرح محض موٹے موٹے وظائف کے لیے مقالے لکھنا صحیح نہیں، اس سلسلہ میں فاضل صدر نے جو کار آمد مشورے دیے ہیں وہ یونیورسٹی کے اساتذہ کیلئے ہر طرح قابلِ غور ہیں،

اس کھلے اجلاس کے بعد کانفرنس کے مختلف شعبوں کے جلسے تین روز تک ہوتے رہے، یہ مختلف شعبے حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) ویدک (۲) ایرانی (۳) کلاسیکل سنسکرت (۴) اسلامک اسٹڈیز (اسلامیات) (۵) عربی و فارسی (۶) پراکرت اور جین ازم (۷) تاریخ (۸) آثار قدیمہ (۹) ہندوستانی لسانیات (۱۰) ڈراویڈک اسٹڈیز (۱۱) ہندوستانی فلسفہ اور مذہب (۱۲) ٹکنیکل سائنس (۱۳) پالی اور بدھ ازم (۱۴) اردو (۱۵) ہندی

ان ۱۵ شعبوں میں پانچسو نمایندوں کے تقسیم ہوجانے کے بعد ہر شعبہ میں حاضرین کی تعداد بہت تھوڑی



رہ جاتی ہے، اس لیے حاضرین کو اکٹھا رکھنے اور پھر وقت بچانے کی خاطر شعبوں کے کئی صدارتی خطبات ایک ہی نشست میں پڑھے جاتے ہیں، چنانچہ اس موقع پر بھی ایرانی، فارسی و عربی، اسلامیات اور ٹکنیکل سائنس کے خطبات یکے بعد دیگرے پڑھے گئے، یہ صدارت کی روایت و شان کے خلاف ضرور ہے، کیونکہ صدارتی خطبہ مقالہ بن کر رہ جاتا ہے، لیکن کانفرنس کے کارکنوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہیں،

شعبۂ اسلامیات کے صدر پروفیسر سید حسن (صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) تھے، جو اپنی طالبعلمی کے زمانہ سے پٹنہ یونیورسٹی کے مایۂ ناز فرزند ہیں، اور اب وہاں کے ممتاز اور لائق اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں، فارسی و عربی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کے صدر رہ چکے ہیں، فارسی کے کئی اہم قلمی نسخے اڈٹ کرنے کی وجہ سے ایران کے علمی حلقوں میں بھی مشہور ہیں، انھوں نے اپنے خطبہ میں دار المصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی، دائرۃ المعارف حیدرآباد، ندوۃ العلماء لکھنؤ، شعبۂ اسلامیات علی گڑھ، اسلامک انسٹیٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ ان عربک اینڈ پرشین پٹنہ، اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی، مجلس علمی ڈابھیل، ادارۂ تحقیقات علوم مشرقیہ ٹونک اور دار العلوم دیوبند وغیرہ میں اسلامی علوم و فنون پر جو کام ہو رہے ہیں اُن پر خاطر خواہ طریقہ پر تبصرہ کیا۔

اداروں کے کارکنوں کے علاوہ ڈاکٹر عبد العلیم مرتب معرفت المذاہب، ڈاکٹر مختار الدین مرتب فضائل من اسمہ، احمد او محمد، المختار من شعر ابن الدمینۃ، اختیار الخالدین، و رسالہ فی ضبط مواضع من الحماسۃ، قاضی زین العابدین میرٹھی مولف قاموس القرآن، مولانا منظور نعمانی مؤلف معارف الحدیث اور دوسرے ارباب علم کا بھی ذکر خیر تھا، انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا: "ہمارا ملک وسیع و عریض ہے، اور یہاں مسلمان تقریباً ایک ہزار سال سے آباد ہیں، مسلمانوں کی تالیفات کا ایک کثیر سرمایہ قدیم الایام سے اکٹھا ہو گیا ہے، یہ سرمایہ ملک کے مختلف گوشوں میں بکھرا پڑا ہے،

اور اس کا محض ایک حقیر حصہ طبع ہو سکا ہے، اور باقی ماندہ مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کے تاریک گوشوں میں پڑا ہوا ہے، ذاتی کتب خانوں تک دسترس اکثر مشکل ہوتی ہے، جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے، یہ کتب خانے عدم توجہی یا آفات ارضی و سماوی سے تلف ہوتے جاتے ہیں، ابتک ایسے بہت سے بیش بہا خزانے تباہ و برباد ہو چکے ہیں، جو کچھ باقی بچ گیا ہے، اس کو بچانا اور محفوظ کر لینا ہے،

اس کے لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایسے سرمایہ کے مالکوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ان کو کسی نہ کسی مشہور کتب خانہ میں جمع کر دیں، ان کی یہ بھی تجویز تھی کہ اسلامی علوم کے متعلق مضامین کی ایک سیر حاصل فہرست مرتب ہو، اور ایک ایسا ادارہ بھی ہو جو مختلف مرکزوں کی تحقیقی و علمی سرگرمیوں میں باہمی تعاون و رابطہ قائم کرے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ منطق و ریاضی میں ہندوستان میں بہت سی کتابیں عربی و فارسی میں لکھی گئیں، جن میں سے بیشتر مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں، ادارے ان کی طرف بھی توجہ کریں، آخر میں انھوں نے کہا کہ علم انسان کا ایک گراں بہا خزانہ ہے، یہ خزانہ کسی فرد واحد یا کسی خاص جماعت کی ذاتی ملکیت نہیں ہے، ہم کو علم کی مسرت میں تمام لوگوں کو شریک کرنا چاہیے، لیکن ہمارا علم صحیح علم ہونا چاہیے، صحیح علم ہی تمام ترقیوں کی بنیاد ہے، لہذا اسلامی علوم کے مطالعے اور تحقیق کے سلسلہ میں ہمارا طریق کار تنگ نظری، ذاتی پسند، فرقہ وارانہ اور سیاسی طبقات سے بالکل مبرا ہونا چاہیے، ہمارا مقصد محض حقیقت کی دریافت ہونی چاہیے، اسلام نے صداقت کی تاکید کی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کی تعلیم پر کاربند ہوں۔

اس شعبہ میں جو مقالات پڑھے یا پیش کیے گئے، وہ یہ تھے:

(۱) اسلامی تمدن نے ہندوستان کو کیا دیا، از سید صباح الدین عبدالرحمن دار المصنفین اعظم گڈھ (۲) قاضی صاعد اندلسی کی طبقات الامم کے نئے اڈیشن کی تجویز، از ڈاکٹر محمد صابر خاں پرنسپل جھارگرام گورنمنٹ کالج مغربی بنگال (۳) لطف اللہ کا سفر نامہ، از ڈاکٹر ثروت علی (۴) پان اسلام ازم



کا نیا رخ از ڈاکٹر ہینس کروزے شملہ (۵) ہندوستان کی ٹرکیں البیرونی کے بیان کے مطابق از ڈاکٹر مقبول احمد شملہ (۶) قرآن میں حق اور فرض کا تصور، از ڈاکٹر عبدالحق انصاری وشوا بھارتی، (۷) اسلامیات کے مطالعہ کی ضرورت، از ڈاکٹر عابد رضا بیدار نئی دہلی (۸) عربی و فارسی حروف تہجی کی دیوناگری رسم الخط میں نمایندگی، از ڈاکٹر نظام الدین گوریکر بمبئی (۹) مومن کی شاعری میں مذہبی عنصر، از جی ایس رفیع الدین (۱۰) ملا محمد عارف شیدا اور ان کی شاعری، از ڈاکٹر ام، اے، ایچ فاروقی گجرات کالج، احمد آباد،

ان مقالات میں ڈاکٹر محمد صابر خاں کا مقالہ غور سے سنا گیا، انھوں نے بتایا کہ قاضی صاعد الاندلسی کی طبقات الامم بیروت میں ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی، جو چار قلمی نسخوں کی مدد سے ترتیب دی گئی تھی، اس کی اشاعت کے بعد سے ابتک اس کے ۹ نسخے اور معلوم ہو چکے ہیں، اس لیے ان قلمی نسخوں کی روشنی میں ایک نئے اڈیشن کی سخت ضرورت ہے، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بیروت کے اڈیشن میں کافی غلطیاں ہیں، جن میں سے کچھ کی نشاندہی بھی کی، امید ہے اہل علم فاضل مقالہ نگار کی اس تجویز کو مفید سمجھ کر اس پر غور کریں گے،

ڈاکٹر ہینس کروزے کے مقالہ "پان اسلام ازم کا نیا رخ" پر گرم بحثیں رہیں، آج کل اسلامی ملکوں کے اتحاد کی جو تحریک چلی ہے، اس پر فاضل مقالہ نگار کا تبصرہ ہمدردانہ نہ تھا، ان کے خیالات کی تردید کرتے ہیں ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ زیادہ پیش پیش رہے،

جناب عابد رضا بیدار کا مقالہ "اسلامیات کے مطالعہ کی ضرورت" اپنی تجویزوں کے لحاظ سے مفید سمجھا گیا، انھوں نے اپنے مقالہ میں اردو کو ایک اسلامی زبان کہا، اس پر ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی، کہ یہ ہندوستانی زبان ہے یا اسلامی، آخر میں ڈاکٹر عبدالعلیم (صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی) نے یہ کہکر بحث ختم کرائی کہ اس میں شک نہیں کہ اردو میں اسلامیات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ

شاید ہی کسی اور زبان میں ہو، لیکن یہ زبان درحقیقت ہندوستانی ہے، خود مقالہ نگار اسکو ہندوستانی زبان ماننے کے لیے تیار ہوگئے۔

شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد (صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی) نے کی، جنھوں نے اپنی علمی تحقیقات کی وجہ سے ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی ہے، ان کا خطبہ مختصر ضرور تھا لیکن بہت ہی مفید اور پر از معلومات تھا، جو امید ہے کہ کانفرنس کے باہر بھی اہل علم کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھا جائیگا، انھوں نے ہندوستان میں عربی و فارسی زبان کی تعلیم کی اہمیت یہ کہہ کر بتائی کہ ان ہی دونوں زبانوں کے ذریعہ سے ہندوستان کے تعلقات افغانستان سے مراکش تک اور ملایا اور انڈونیشیا سے قائم ہو سکتے ہیں، پھر انھوں نے ہندوستان کے اُن ارباب علم کا ذکر کیا جن کے علمی کارناموں کو اسلامی ممالک نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، مثلاً مولانا رضی الدین حسن صغانی (المتوفی ۶۵۰ھ) کی مجمع البحرین فی اللغۃ اور العباب الذاخر و اللباب الفاخر عربی میں ابتک مستند لغات سمجھی جاتی ہیں، اسی طرح مولانا شہاب الدین دولت آبادی اور شیخ محدث دہلوی کی تصانیف عربی ممالک میں مقبول ہوئیں، شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ اور مولانا محب اللہ بہاری کی مسلم الثبوت وہاں کے نصاب میں داخل ہیں، مولانا عبد الحی فرنگی محلی کی الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ۱۳۲۴ھ میں قاہرہ سے پھر ان کی تین اور کتابیں الرفع والتکمیل، الاجوبۃ الفاضلہ اور اقامۃ الحجۃ شام سے باضابطہ اڈٹ ہونے کے بعد شائع ہوئی ہیں، پھر مولانا عبد الحی حسنی کی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ۱۹۵۸ء میں دمشق سے شائع کی گئی ہے،

ہندوستان میں فارسی کی اہمیت یہ کہکر بتائی کہ نہ صرف اردو بلکہ مراٹھی، پنجابی، بنگالی اور گجراتی زبانوں میں اس کے اثرات ابتک باقی ہیں، اور پھر ہندوستان ہی کو اس اولیت کا شرف حاصل ہے کہ تصوف کی پہلی کتاب کشف المحجوب اور فارسی شعراء کا پہلا تذکرہ لباب الالباب اور فن حرب کی قدیم ترین تصنیف آداب الحرب و الشجاعہ اسی سرزمین میں قلمبند ہوئی، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اسدی کی لغات الفرس کے بعد فرہنگ نامۂ قواس قدیم ترین لغت ہے، جو سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں مرتب ہوئی، اس کے بعد فارسی لغات میں ۷۴۳ھ میں دستور الافاضل ۸۲۲ھ، ادات الفضلاء اور ۸۳۷ھ میں بحر الفضائل یہیں ترتیب دی گئی، پھر بڑے وثوق کے ساتھ یہ بھی کہا کہ فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، لغات شاہجہانی، معربات رشیدی، برہان قاطع، سراج اللغات اور بہار عجم جیسے لغات کے مولفوں کی ایسی قابلیت رکھنے والے ایران میں پیدا نہ ہوئے، اسی خطبہ سے معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ سلاطین دہلی کے عہد کے شعراء میں سے سراجی، عمید تولکی، برہان الدین بزاز، تاج الدین بخاری، اعز الدین علوی، حکیم تاتاری اور محمود خطاط کے فارسی کلام کا پتہ چل گیا ہے، حالانکہ خیال تھا کہ وہ مفقود ہو چکے ہیں، اسی طرح چودھویں صدی کے بعض فارسی شعراء میں سے مغیث الدین ہانسوی، بختستان و بیرامیر تعیاد الدین، جمال الدین اسناجی، حمید قلندر، تاج شیرازی اور الیاس ہروی وغیرہ کے بھی کلام دستیاب ہوگئے ہیں، اگر ان شعراء کے کلام چھپکر منظر عام پر آگئے تو یہ مفید علمی و ادبی خدمت ہوگی، اور ہندوستان کی علمی و ادبی تاریخ کے بعض تاریک گوشے روشن ہوتے نظر آئیں گے، ایران سبک ہندی کو پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے ہندوستان کے فارسی شعرا کے کلام کی طرف اس کی توجہ نہیں تھی، لیکن اس خطبہ سے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ وہاں سے ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان، خسرو، عرفی، نظیری، صائب اور کلیم کے دواوین شائع کیے گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کا یہ مشورہ ہے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے ادارے قائم ہوں جو امام صغانی، امیر خسرو، غلام علی آزاد بلگرامی، بیدل، غالب اور نواب صدیق حسن خاں کی کتابیں شائع کریں، اس موقع پر پروفیسر عطاء الرحمن صدر فارسی و عربی انسٹیٹیوٹ پٹنہ بھی موجود تھے، اگر وہ اس مفید مشورہ کو عملی جامہ اپنے انسٹیٹیوٹ کے ذریعہ سے پہنائیں تو علمی حلقہ ان کا ممنون ہو، کیونکہ اس کے لیے کسی نئے ادارہ کا قائم ہونا تو بہت مشکل ہے۔

ہندوستان میں عربی اور فارسی میں جو کام ہو رہا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں اسکی بھی تفصیل بتائی، مثلاً دائرۃ المعارف حیدر آباد سے ابتک ۵۰۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے ابھی حال ہی میں طب پر محمد بن زکریا رازی کی تصنیف کتاب الحاوی کی اٹھارہ جلدیں، علی المتقی الہندی کی کنز العمال کی ۲۰ جلدیں، سمعانی کی کتاب الانساب کی پانچ جلدیں، پھر ابن القفطی کی المحمدون من الشعراء، قاسم بن سلمی الہروی کی غریب الحدیث ابن حبیب البغدادی کی المنمق، صدر الدین علی بن ابی الفرج البصری کی الحماسات البصریہ شائع ہو چکی ہیں، مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد کی طرف سے امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب الحجۃ، امام ابو یوسف کی کتاب الآثار، امام محمد کی کتاب الآثار شائع ہوئی ہیں، عربی و فارسی انسٹیٹیوٹ پٹنہ نے قدامہ المقدسی کی کتاب التوصیت، دیوان رکن الدین صائن، امیر خسرو کی تحفۃ الصغر، کلیات حکیم پریشان اور کلیات امین عظیم آبادی شائع کی ہے، حیدر آباد کی مجلس فارسی مخطوطات کی طرف سے سلک سلوک اور جامع الحکایات چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، حیدر آباد ہی سے نثاری بخاری کی مذکر احباب کی اشاعت ہوئی ہے، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس اینڈ کلچر نے مثنویات محسن اور دیوان غنی کشمیری شائع کی ہیں، مولانا امتیاز عرشی نے رامپور سے تفسیر سفیان ثوری کو اڈٹ کرکے شائع کیا ہے، پھر اس وقت تک المزی کی تحفۃ الاشراف فی معرفۃ الاطراف، نواب صدیق حسن خاں کی التاج المکلل شائع ہو چکی ہیں،

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ

"حال کی تحقیقات نے یہ ظاہر کر دیا کہ شبلی کی شعر العجم اور عبد الغنی کی فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں ترمیمات، توضیحات اور نظر ثانی کی خاطر خواہ ضرورت ہے"

ڈاکٹر صاحب کے ذوق کی بلندی کا تقاضا یہ نہ تھا کہ وہ مولانا شبلی کی شعر العجم اور پروفیسر عبد الغنی کی فارسی زبان و ادب کی تاریخ کو ایک سطح پر رکھتے۔



اورنیٹل کانفرنس کے صدر کے خطبہ میں جو کمی رہ گئی تھی، اُس کی تلافی پروفیسر سید حسن اور ڈاکٹر نذیر احمد کے خطبوں سے ہو گئی، اس شعبہ میں حسب ذیل مقالے پڑھے یا پیش کیے گئے۔

(۱) ہیچ نامہ از ڈاکٹر ممتاز علی خان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲) مثنوی مولانا روم کی شرح بحر العلوم از ڈاکٹر نعیم الدین پرنسپل گورنمنٹ کالج امراؤتی (۳) معدن الانشاء تالیف بھولا ناتھ سرابھائی جہتا از ڈاکٹر سی، آر، نایک، گجرات یونیورسٹی احمد آباد (۴) واؤ از ڈاکٹر آموجہ دہلی (۵) ساسی ادب از ڈاکٹر شان، پنجاب یونیورسٹی (۶) کلکتہ میں فارسی ادب، از ڈاکٹر عبد السبحان کلکتہ (۷) رانی چندر کرن اور چتر کرن، از ڈاکٹر امیر حسن عابدی، دہلی یونیورسٹی (۸) حافظ کی شاعری پر اُن کے ماحول کا اثر از کبیر احمد جائسی، ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۹) ابن تیمیہ کی ایک نادر کتاب منسوب بالبغدادی، از فضل الرحمٰن گنوری ناگپور یونیورسٹی ناگپور (۱۰) ایک قدیم فرہنگ شرف نامہ از سید طارق حسن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۱) ابن الخطیب اور ابن خلدون کی چشمک، از احتشام حسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۲) سعد اللہ عاشق غازیپوری، از عطاء الرحمٰن کاکوی، صدر عربی و فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ پٹنہ (۱۳) عباسی عہد کا ایک فراموش شدہ مصنف ابن الدایہ البغدادی از ڈاکٹر مختار الدین احمد، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۱۴) جنوبی ہند کے ہندو فارسی شعراء، از سید محمد فضل اللہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (۱۵) نجیب نامہ از افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن، صدر شعبۂ فارسی عربی، اردو، مدراس یونیورسٹی (۱۶) سی نامہ از پروفیسر سید حسن (شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) (۱۷) فارسی شاعری میں غالب کا درجہ، از ڈاکٹر وارث کرمانی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

کانفرنس کے اس اجلاس میں اردو کا بھی ایک شعبہ بڑھایا گیا تھا، جو اس کا مستقل شعبہ نہیں لیکن جب دہلی، یوپی، بہار میں اس کا اجلاس ہوتا ہے تو اردو کو ان علاقوں کی ایک زبان سمجھ کر اس کا شعبہ بھی بڑھا دیا جاتا ہے، اس کے صدر، جناب مالک رام صاحب تھے، جو غالبیات کے ماہر ہونے کے علاوہ

اپنی علم دوستی، ذوق کی ستھرائی، دوست نوازی اور اردو زبان سے غیر معمولی شیفتگی کی وجہ سے ملک میں مشہور ہیں، اتفاق سے وہ اور میں دونوں جناب الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی صاحب ظلہٗ کی محبت و شفقت سے بھری ہوئی میزبانی سے فیضاب ہوتے رہے، کانفرنس کی نشستوں کے علاوہ جناب شروانی صاحب مدفیوضہٗ کے دولت کدہ پر دلچسپ صحبتیں رہیں، جناب مالک رام صاحب پنجاب کے رہنے والے ہیں، لیکن اٹھنے بیٹھنے، اخلاص و محبت سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے، رہنے سہنے، برجستہ لطیف فقرے کہنے میں دہلی اور لکھنؤ کے پرانے لوگوں کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں،

شعبۂ اردو میں اُن کا خطبہ سننے کے لیے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، اس کا رنگ اور دوسرے صدارتی خطبوں سے الگ تھا، انھوں نے اس کا ایک خاص عنوان اردو میں تحقیق رکھا جس میں انکے اپنے انداز کی للکار کے ساتھ پھٹکار بھی تھی، انھوں نے مولانا شبلی کی شعر العجم کے متعلق فرمایا کہ اس میں بعض تاریخی غلطیاں ہیں، اس کے لکھنے میں شبلی نے سہل انگاری سے کام لیا، انھوں نے دوسروں کی لکھی لکھائی باتوں اور تاریخوں پر اعتماد کر کے خود جستجو کی زحمت گوارا نہ کی، وہ بالعموم اختلافی مسائل میں اپنی فیصلہ کن رائے دینے سے اجتناب کرتے، انھوں نے محاکمہ کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ ان میں سے کونسی چیز درست ہے اور کونسی غلط، آج تک کسی کو تنقیداتِ شعر العجم کے جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دار المصنفین کے نمایندہ کی حیثیت سے ان تنقیدوں کو بہت خندہ پیشانی سے ضرور سنا لیکن سنتے وقت یہ ضرور خیال آیا کہ موجودہ دور میں جب کوئی نو آموز و شہرت پسند نوجوان نقاد آزاد، حالی اور شبلی پر کچھ لکھتا ہے تو اُن کے آفتابِ علم پر خاک ڈال کر اپنی تنقید نگاری کا حق ضرور استعمال کرتا ہے، لیکن جناب مالک رام جیسے مرنجاں مرنج طبیعت رکھنے والے پختہ اہل قلم کے لیے اورنٹیل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے یہ حق استعمال کرنا اُن کی شان کے مطابق نہ تھا، انھوں نے اپنے خطبہ کے بعد



مجھ سے کہا کہ میں نے آپکے جد امجد کی خبر لی ہے، اور کیا یہ صحیح نہیں کہ کسی کو تنقیداتِ شعر العجم کے جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی، میں نے ان سے کہا کہ اس کا جواب تو دیا جا چکا ہے کہ شعر العجم حسن و عشق کا صحیفہ ہے، واقعات کی کھتیونی نہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ تنقیداتِ شعر العجم واقعات کی کھتیونی ہی سمجھی جائے گی، جس کا شاید کوئی اور اڈیشن پھر نہ نکلے، اور شعر العجم حسن و عشق کے صحیفہ کی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ پڑھی جائے گی، جس کے اڈیشن اُس وقت تک نکلتے رہیں گے جب تک اردو زبان قائم ہے،

معارف کے متعلق جناب مالک رام صاحب کا ارشاد ہے:

اردو میں تحقیقی رسائل و جرائد گویا ہیں ہی نہیں، بے شک معارف اور برہان موجود ہیں، لیکن ان کا دائرۂ کار محدود ہے، وہ زیادہ تر دینی اور فقہی مسائل کے لیے مخصوص ہو کے رہ گئے ہیں، ان میں گاہے گاہے کوئی ادبی مضمون بھی غلطی سے چھپ جاتا ہے، لیکن سچ پوچھیے کر انکی عام افتاد کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بے محل سا معلوم ہوتا ہے

معارف پر یہ تنقید پڑھ کر معارف کے ناظرین بے ساختہ کہہ اٹھیں گے کہ یہ رائے درست تو کسی لحاظ سے نہیں، صریحاً درشت ہے، اگر یہ رائے ایک ایسے شخص کی ہوتی جو معارف کبھی کبھی پڑھتا ہو، تو کوئی تعجب نہ ہوتا، لیکن مالک رام صاحب ایک مدت مدید سے معارف کے خریدار ہیں، اور جب کوئی پرچہ ان کے پاس نہیں پہنچتا ہے تو اس کے لیے اپنی بیقراری کا اظہار کرتے ہیں، معارف کے بہت سے ناظرین کو یہ شکایت ہے کہ وہ اس کو مذہبی رسالہ سمجھکر اٹھاتے ہیں لیکن وہ اس میں زیادہ تر علمی مضامین دیکھ کر چھوڑ دیتے ہیں،

آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے مجھکو کیا خراب — دل یہ کہے کہ آنکھوں نے مجھکو ڈبو دیا
جھگڑا کسی کا کچھ نہیں اے درد عشق میں — دونوں کی ضد نے مجھکو بلا میں ڈبو دیا

جناب مالک رام صاحب نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے

"پی ایچ ڈی کی سند کے جو مقالے اب تک شائع ہوئے، افسوس کہ ان میں سے بیشتر مایوس کن ہیں، میں اس افسوسناک صورت حال کے لیے یونیورسٹیوں کے ان پروفیسروں کو کو ذمہ دار گردانتا ہوں جو ان طلبہ کے کام کی نگرانی کرتے ہیں یا جن کی راہنمائی میں تیار ہوتے ہیں...... یوں لگتا ہے جیسے ان یونیورسٹیوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ہر مقالہ نگار کو سند لازماً عطا کر دی جائے گی...... مستقبل میں مورخ ان کو ہرگز معاف نہیں کریں گے"۔

خطبہ کے اس حصہ کو ان کے عزیز دوست پروفیسر آل احمد سرور نے زیر لب تبسم کے ساتھ سنا۔

جناب مالک رام صاحب نے آزاد اور حالی پر بھی چھینٹے ڈالے ہیں، لیکن ان کا دل بہت ہی نرم اور قلم بہت ہی خوشگوار ہوگیا ہے، جب انھوں نے محمود شیرانی اور پھر قاضی عبدالودود کا ذکر کیا ہے، قاضی عبدالودود کے متعلق فرمایا:

میرا ایمان ہے کہ جہاں تک فارسی علم و ادب کا تعلق ہے آج ملک بھر میں ان کی برابر کا شاید ہی کوئی اور عالم ہو...... انھوں نے ہمارے نئے لکھنے والوں کے لیے احتیاط اور محنت کی مثال قائم کی ہے......

خطبہ کے بعد میں نے ان سے کہا کہ عظیم آباد پٹنہ والوں کا یہ دعویٰ ہوگا کہ پروفیسر کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کی وجہ سے تنقید نگاری اور تحقیق دونوں کی امامت ان کے ہاتھوں میں آگئی ہے، آپ نے اورنٹیل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے دونوں کی نہ سہی، ایک کی سند تو دے ہی ڈالی جس سے عظیم آباد والوں کو اپنا دعویٰ صحیح ثابت کرنے میں اور بھی مدد ملے گی، لیکن مالک رام کے اس ایمانِ راسخ پر بمبئی کے ایک اہل علم نے کہا کہ اس رائے میں حقیقت سے زیادہ عقیدت اور ذاتی محبت کو دخل ہے، قاضی عبدالودود صاحب کی نظر اردو شعراء سے متعلق فارسی تذکروں پر ضرور اچھی ہے، لیکن فارسی علم و ادب پر ان کا کوئی کارنامہ نہیں جس کے بعد یہ کہا جائے کہ ملک میں ان کے برابر



شاید ہی کوئی اور عالم ہو،

جناب مالک رام صاحب کے خطبہ میں ان کی بے جھجک باتوں کی وجہ سے نزاعی رنگ آگیا ہے، اس لیے مجموعی حیثیت سے یہ خاصہ کی چیز نہ ہو سکا جس کی توقع عام سامعین کو تھی،

اس شعبہ میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے:

(۱) عشق نامۂ واجد علی شاہ، از کوکب مرزا، کلکتہ (۲) شاد عظیم آبادی از پروفیسر عطاء الرحمن صدر شعبۂ فارسی و عربی انسٹیٹیوٹ پٹنہ (۳) انیس و دبیر سے پہلے دہلی کے مرثیہ گو، از جناب علی جواد زیدی صاحب، نئی دہلی (۴) آغا حشر، از انجم آرا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۵) شمالی ہند کی پہلی نثری داستان از ڈاکٹر مسعود حسین، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن (۶) عبداللہ فتحپوری کے منظوم ڈرامے، از سید فرخ علی جلالی (۷) ہمزہ کیوں؟ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، دہلی (۸) حیدری کا تذکرہ گلشن ہند از ڈاکٹر مختار الدین، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۹) نے فاعلی کا استعمال، از سری چوہان۔

میں اس کی ایک نشست میں اس وقت شریک ہوا جب جناب علی جواد زیدی صاحب اپنا دلچسپ مقالہ پڑھ رہے تھے، جو بہت غور سے سنا جا رہا تھا، انھوں نے اس میں اردو کی مرثیہ نگاری کے ارتقاء کی کچھ گم شدہ کڑیوں کو سامنے لاکر مفید معلومات فراہم کیے ہیں، ان کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ایک ریسرچ طالبہ انجم آرا نے آغا حشر پر اپنا مضمون اسی انداز میں پڑھا جس طرح پڑھنا چاہیے،

پروفیسر آل احمد سرور کی کوشش سے ایک چھوٹا سا مشاعرہ بھی منعقد ہوگیا، پہلے سے اس کا پروگرام نہ تھا، لیکن کانفرنس کے نمائندوں کی خواہش پر سرور صاحب نے ان کی ادبی ضیافت کا سامان بہم کر کے مزید میزبانی کا ثبوت دیا، اس میں جن شعراء نے سامعین کو محظوظ کیا ان کے نام یہ ہیں: علی جواد زیدی صاحب، ڈاکٹر معین احسن جذبی، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، پروفیسر آل احمد سرور، اختر انصاری، پروفیسر عطاء الرحمن کاکوی، ذوقی صاحب، شہریار، صبا جائسی، امیر عارفی، شمسی طہرانی، ڈاکٹر بھدر

(یہ ہندی کے شاعر ہیں) اور ڈاکٹر تشال (پنجابی زبان کے شاعر ہیں)

مجھکو کانفرنس کے اور شعبوں میں شرکت کرنے کا موقع نہ ملا لیکن مقالات کے خلاصوں کی دو جلدوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ مقالات کلاسیکل سنسکرت کے شعبہ کے لیے آئے، انکی تعداد پچاس سے بھی زیادہ تھی، وید کے سیکشن میں مقالات چالیس، ہندوستانی لسانیات میں تیس، تاریخ میں اٹھائیس، ہندوستانی فلسفہ اور مذہب میں چوبیس، ٹیکنیکل سائنس میں انیس، پالی اور بدھ ازم میں سات، پراکرت اور جین ازم میں نو، ڈراویڈک میں تین، ایرانین میں پانچ مقالات پیش ہوئے، ان شعبوں میں ہندوستانی فلسفہ کے شعبہ میں ڈاکٹر عشرت حسن انور (ہیڈ شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی) نے Testing Iqbal philosophical test of the revelation of religious experience اور تاریخ کے شعبہ میں پروفیسر حسن عسکری (پٹنہ یونیورسٹی) نے امیر خسرو کی اعجاز خسروی کی روشنی میں اس عہد کے معاشرتی حالات اور ڈاکٹر کانتی لال اف. سوم پورا (کالوپور، احمد آباد) نے "کیا نورجہاں نے اپنے نام سے سکے جاری کیے" کے عنوانات سے بھی مضامین پیش کیے،

اس موقع پر مسلم یونیورسٹی آزاد لائبریری میں کتابوں کی ایک نمائش بھی تھی جس میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ تلسی داس کی رامائن کے تین نسخے، فیضی کی بھگوت گیتا (مکتوبہ ۱۲۴۴ھ) رامائن مترجمہ امر داس ، مہابھارت از فن اول تا یازدہم مترجمہ فیضی کے کئی نسخے، جوگ بششت از دارا شکوہ (مکتوبہ ۱۰۶۶ھ) شیو پوران مترجمہ کشن سنگھ ولد رائے پران ناتھ کھتری (مکتوبہ ۱۰۲۳ھ) کتھا راجہ گوپی چند، سداما چرتر از مصر اما دھو، سبھا بلاس از یوسف، سورساگر از سورداس مدھونایک سنگار از سید نظام الدین احمد (مکتوبہ ۱۲۶۴ھ) اور پدماوت کے نو نسخے تھے، یہ سب فارسی رسم الخط میں تھے، پدماوت کا ایک اردو ترجمہ کا بھی قلمی نسخہ تھا، مترجم کے نام عبرت اور غلام علی حسرت درج تھے، ان کے علاوہ غزالان الہند مؤلفہ غلام علی آزاد بلگرامی (مکتوبہ ۱۲۰۴ھ) سبحۃ المرجان



از غلام علی آزاد بلگرامی (مکتوبہ ۱۱۸۱ھ) راگ درپن از فقیر اللہ (مکتوبہ ۱۰۷۶ھ) اور فردوسی کے شاہنامہ کے کئی مصور نسخے تھے۔

اس کانفرنس کا آئندہ ۲۴ واں اجلاس ہندو یونیورسٹی بنارس میں ہوگا، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اس کے فارسی و عربی شعبہ کے صدر ڈاکٹر مختار الدین (شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی) منتخب ہوئے ہیں، جنھوں نے عربی کے بعض اہم مخطوطات کو اڈٹ کرکے مفید علمی خدمت انجام دی ہے اور وہ اپنے علمی ذوق کی ستھرائی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ شعبۂ اسلامیات کی صدارت کے لیے ڈاکٹر نظام الدین گوریکر کا انتخاب ہوا ہے، وہ سینٹ زیویر کالج بمبئی میں اردو کے استاد ہیں"

اس روداد کو ختم کرنے سے پہلے ڈاکٹر نذیر احمد (صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی) کے اس پُرتکلف عشائیہ کا بھی ذکر ضروری ہے جس میں انھوں نے مختلف ریاستوں کے اہل علم کو مدعو کرکے ایک بین الریاستی اجتماع کی شان پیدا کردی، اس میں جناب سید شمس الہدیٰ ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات آسام، افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن صدر شعبۂ عربی و فارسی، مدراس یونیورسٹی، نعیم الدین صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج امراؤتی، مدھیہ پردیش، جناب فضل الرحمن گنوری صاحب، ناگپور یونیورسٹی ، ڈاکٹر مسعود حسین شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، جناب سید فضل اللہ صاحب، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ریڈر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی، جناب علی جواد زیدی صاحب، نئی دہلی، پروفیسر سید حسن (صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی) پروفیسر عطاء الرحمن کاکوی، صدر فارسی و عربی، انسٹیٹیوٹ، پٹنہ، پروفیسر سید محمد احمد (صدر شعبۂ عربی، پٹنہ یونیورسٹی) جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب شعبۂ عربی، الہ آباد یونیورسٹی، یہ خاکسار، مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر مختار الدین شریک ہوئے، مدعوین شعر و شاعری کی ایک پرلطف مجلس سے بھی محظوظ ہوکر ایک دوسرے سے علحدہ ہوئے۔

---

# دسویں صدی ہجری کے ۲ دو رجائی

از ڈاکٹر ام ہانی فخر الزماں ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا حسن علی خراس رجائی : تذکرہ نویسوں نے اس کے بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن ایرانی درباروں میں اس کو خاص تقرب حاصل تھا، اور مرزا اشرف جہاں قزوینی جو خود صاحب دیوان شاعر تھا، اس کا دلدادہ تھا، اس لیے اس کے حالات زندگی اور کلام کا تفحص ضروری تھا، میر علاء الدولہ قزوینی کو اس سے ذاتی واقفیت تھی، اس لیے اس نے اس کے حالات کی کافی صراحت کی ہے، نفائس المآثر میں لکھتا ہے کہ اس شاعر کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عالم شباب میں اس کو ایک جوان سے محبت ہو گئی تھی، اس جوان کی دکان خراس خانہ میں تھی، اکثر اوقات شاعر مذکور بھی وہیں رہتا تھا، اس لیے خراس مشہور ہو گیا، وہ متعدد اکابر اور اولیا کی ملاقات سے بھی مشرف ہوا، اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ محمد خاں تکلو حاکم ہرات جو شیعیت میں غلو کے لیے اتنا ہی مشہور تھا جتنا حسن علی اپنے تسنن میں، لیکن وہ حسن علی پر انتہائی مہربان تھا، اور اسمٰعیل مرزا کا یہ حال تھا کہ حسن علی کو اپنے اور اپنے بھائی سلطان محمد مرزا کے درمیان جگہ دیتا تھا، حسن علی علم حدیث میں میرک شاہ محدث کا شاگرد تھا، اس نے شیخ نظامی کو خواب میں دیکھا اور اسکی ہدایت کے مطابق رجائی تخلص اختیار کیا، شعبان ۹۶۵ھ میں جب حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اسوقت اس کی عمر اٹھاسی سال تھی، راستے میں قزوین میں قیام کیا، اس وقت مرزا اشرف جہاں نے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا تھا، حسن علی نے یہ قطعہ لکھکر مرزا کی خدمت میں بھیجا:



حکایتی ست غریبی کہ مرد دانش و فضل — کہ عرض آں نتواں کرد جز بچون تو کسی
گذشتہ از وطن آوارہ ایم رو بسفر — گسستہ ایم دل از ہر ہوا و ہر ہوسی
بغیر گوشۂ چشمی ز صاحبانِ نظر — نگشتہ در دلِ ما ہیچگونہ ملتمسی
ہمای اوجِ کمالی، چہ نقص بودی اگر — ز فر سایۂ تو بہرہ ور شدی مگسی
حمیم گلشنِ کویت نشد نشیمنِ ما — بیافتیم دریغ اعتبار خار و خسی
بروی خستہ دلاں بستن در اقبال — ز حسنِ خلقِ کریمت عجب نمود بسی
بصدقِ خاکِ درت غائبانہ می بوسم — بپای بوس سگانت چو نیست دسترسی

مرزا اشرف نے جواب میں حسب ذیل قطعہ لکھکر مولانا کو بھیجا:

ایا ستودہ خصالی کہ سالہا دل ما — ہوای صحبتِ جاں پرور تو بود بسی
حکایتی ست نہفتہ ز خلق با ما را — خدای را بشنو و مگو بکسی
ازاں بگلشن دہرم گرفت دل کہ نماند — ز سبزہ و گل ایں باغ غیر خار و خسی
چو غنچہ گر نفسم تنگ میشود ز انست — کسی نماندہ کہ با او بر آورم نفسی
وصالِ ہمچو تو یاری نمی دہد دستم — وگرنہ در دلِ من نیست غیر ازیں ہوسی

اس کے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی، بدنفسوں نے شاہ طہماسپ تک شکایت پہنچا دی، اس نے تبریز میں مولانا کی گرفتاری کا حکم دیدیا، لیکن گرفتاری سے پہلے بلدۂ زنجان میں شوال ۹۶۰ھ میں مولانا کا انتقال ہو گیا، اور شیخ ابو الفرج زنجانی کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

میر صدر الدین محمد (خلف الصدق حضرت میر غیاث الدین منصور علامہ شیرازی) نے کسی مجلس میں مولانا سے پوچھا کہ تم نے اپنا کلام حضرت ملا جامی کی خدمت میں پیش کیا ہے،

مولانا نے عاجزانہ انداز میں تردید کی اور کہا کہ اس کی صرف اس قدر اصلیت ہے کہ ایک گوّیے کی زبانی میرا کلام سن کر مولانا نے تعریف کی تھی، مولانا جامیؒ نے شیخ نورالدین کا مرثیہ بھی لکھا تھا جو درج ذیل ہے:

درین خرابہ مجو رہ بسوی گنجِ مراد
کہ جای محنت و رنج است این خراب آباد

قضا نہادہ بہر گامش از بلا دامی
کہ پا نہادہ درین دامگہ کہ سر ننہاد

زمانِ عمر بسی اندک است غرہ مباش
کہ تا نفس زدہ ای عمر دادہ ای بر باد

چو غنچہ خون خور و دلتنگ باش و لب مکشا
کہ نیست غنچۂ این باغ را امیدِ کشاد

سوادِ دفترِ گل نیست غیر حرفِ فنا
ولی چہ سود کہ بی بہرہ ایم ما ز سواد

نشانِ سرو قدی میدہد کہ خاک شد است
بہر زمین کہ فتاد است سایۂ شمشاد

چو ہر نفس ز چمن میرود بباد گلی
مدام جامہ کبود است سوسن آزاد

اگر ز آتشِ دودِ دلم خبر یابی
رود حدیثِ گل و ذکرِ سوسنت از یاد

مرا انیسِ دلی بود و مونسِ جانی
کہ میزدم بیگانگیش دم از طریقِ وداد

ہوای طوفِ حرم بست محملش ز وطن
نہاد رو بغریبی کہ کس غریب مباد

ندیدہ کام دل از گام سعی در رہِ وصل
بداغِ ہجر چو فرہاد جانِ شیرین داد

کنون منم ز غمش خون دل ز دیدہ چکان
گسستہ دل ز جہان و طمع بریدہ ز جان

---

ہزار حیف از آن نورِ دیدۂ اخیار
جہانِ علم و ادب، کانِ علم، کوہ وقار

چراغِ مجلسِ اصحاب شیخ نورالدین
کی بی فروغِ رخش روز ماست چون شبِ تار

بشامِ ہجرِ من تیرہ روز از غمش
بود چو دامنِ گردون ز خون دیدہ کنار

دریغ و درد کہ چون شد ز چشمِ زخمِ زمان
انیسِ بستر و بالین، جدا ز یار و دیار

چو شمع بر سرِ بالین او بگریہ و سوز
شبی بروز بُردم، بمردم آخر کار



دریغ و درد کہ چون غنچۂ شکرشکنش
پی وصیتِ اصحاب گشت نکتہ گزار

میانِ مجمعِ خونین دلان چون گل ہمہ گوش
بنودم و نشنیدم حدیثی از لبِ یار

دریغ و درد کہ چون مہرِ خامشی بدہان
نہادہ پردۂ حرمان کشید بر رخسار

ہزار نوحہ و زاری نکردم از غمِ او
ہزار جا نزدم چاکِ جیبِ صبر و قرار

ز مرگِ لالۂ سیراب و چون شد گلِ زرد
نکردمش گلِ سوری ز دیدۂ خونبار

ز نعش بست چو محمل بعزم کعبۂ خاک
ازین سراچہ بہمراہیش نبستم بار

خورم دریغ و فشانم سرشکِ خون آلود
ولی چہ سود کہ کرد آنچہ کرد چشمِ حسود

ز چرخ و گردشِ او نالہ و فغان دارم
فغان کہ محنت و اندوہ بیکران دارم

اگر جہان بسر آید، بسر نمی آید
شکایتی کہ ز اندوہ در میان دارم

گمان برم کہ دہم جان درین غم و عجب است
اگر یقین نشود آنچہ در گمان دارم

جدا ز صحبتِ جانان کہ بود خلد برین
مباد جانم اگر آرزوی جان دارم

گذشت آنکہ دل پر امید بر سرِ راہ
نشستہ گوش بر آوازِ کاروان دارم

یکی بوصل فرح داد و دیگری امید
من آنکسم کہ نہ این دارم و نہ آن دارم

ہزار نالہ بر آرم چو از دلِ تنگ
چو غنچہ مہرِ خموشی چہ بر دہان دارم

ز چاکِ سینہ بگردون رسید شعلۂ آہ
چگونہ سوز درون را ز کس نہان دارم

اجل بپرسشِ این خستہ کردہ رنجہ قدم
دلا! منال زمانی کہ میہمان دارم

بیا و گوش کن ای ہمنشین ز من سخنی
کہ آخرین سخن است اینکہ بر زبان دارم

خبر ز گمشدۂ خود نیافتم بجہان
ز بہر دیدنش آہنگِ آن جہان دارم

جدا ز عمرِ گرامی و یارِ جانی خویش
کسی چہ میکند از عمر زندگانی خویش

صبا بخطۂ کابل اگر گذار کنی　　ز گرد رہ چو رسی طوق آں مزار کنی

حریم روضۂ دلدار را بگاہ طواف　　ز خون دیدہ و دل رشک لالہ زار کنی

ز خاک بوسی آں روضہ چوں بروں آئی　　عزیمت در دولت سرای یار کنی

بہادہ روی تواضع بخاک از من زار　　سلام گوئی و اظہار اعتذار کنی

ز بزم جمع چو آں شمع را نہاں بینی　　ز برق آہ جہاں را پر از شرار کنی

دہی بسیل فنا ز آب دیدہ عالم را　　قیامتی کہ نہان است آشکار کنی

بفرق خاک فشانی ز دیدہ خوں ریزی　　نفیر درد کشی نالہای زار کنی

ہزار گونہ شکایت ز دست جور فلک　　ہزار شکوہ ز دستان روزگار کنی

ز حال زار رجائی بلطف چوں پرسد　　بیک دو نکتہ ہماں بہ کہ اختصار کنی

چو بی شمار بود درد او چہ حاصل ازاں　　کہ از ہزار یکی یا دو را شمار کنی

جز ایں حدیث نگوئی کہ رفت با دل چاک

ازیں جہان و تمنای دوست برد بخاک

قضا چو تیغ برآرد بپیچ سر ز قضا　　کہ نیست چارۂ ایں کار جز رضا بقضا

جہان و ہر چہ در و روی در فنا دارد　　خدا ست آنکہ بود وصف او دوام و بقا

خوش آنکہ رخت بنزہت سرای انس کشد　　ازیں سراچہ و شد نیک بخت ہر دو سرا

فشاند دامن ہمت ازاں نشیمن آز　　جہاند مرکب ازیں تنگنای جانفرسا

زدود آئینۂ دل غبار چشم و بدید　　جمال غیب بر آئینۂ ای کہ داد جلا

من و غبار غمی کاں ز دل بروں ز دود　　اگرچہ خاک وجودم رود بباد فنا

ز شرح درد دلم ہیچ بر نمی آید　　بیا کہ دست تضرع بر آورم بدعا



بزرگوارا! خدایا بر رہ نوردانی　　کہ در ہوای تو پیمودہ اند مرحلہ ہا

ز فرق کردہ قدم روی در رہ آوردہ　　نبردہ راہ بیاباں در آمدند ز پا

کہ رحمتی کن از آنجا کہ فضل شامل تست　　بر آں غریب کہ جاں در رہ تو کرد فدا

رسید عور بپوشاں لباس مغفرتش　　بداں گلیم کہ شد پردہ پوش آل عبا

(۲) رجائی۔ سیف الدین محمود کے بارے میں علاء الدولہ لکھتے ہیں کہ علوم ریاضی، نجوم اور رمل سے واقفیت رکھتا تھا، اور فن سیاق میں بے نظیر تھا، ۹۶۲ھ میں مشہد میں قتل کردیا گیا، خلاصۃ الاشعار نے اس کا سنہ وفات ۹۶۶ھ لکھا ہے، نفائس المآثر نے اسکے حسب ذیل اشعار پیش کیے ہیں:

وصلش گزشت و گریۂ ہجرم بخوں کشید　　آں عیشہا زمانہ ز چشمم بروں کشید

ہر دم زیادہ میشود از من ملال تو　　بوی فراق میشنوم در وصال تو

ہر جفا کز دوست آید منتش بر جان من　　روز پیش ہرگز مباد آنکہ منت دار نیست

خواستم ہنگام فرصت عرض حال خود کنم　　گفت میدانم غمت را حاجت اظہار نیست

## قصیدہ

صنوبر قد من کہ نازش بود بر　　بر و بستہ ام دل چو بار صنوبر

مگر مرغ روح خلیل است بلبل　　کہ ہر چند گیں بر فروزد آذر

ازاں سوختن ہیچ پروا ندارد　　زہی رتبۂ عشق اللہ اکبر

ہزلیات اچھا لکھتا تھا،

تحفۂ سامی (ص ۵۹) نے ایک رباعی کے تین مصرع نقل کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

ایں گل کہ دل اہل نظر را خوں کرد　　خوں کرد چنانکہ کس نداند چوں کرد

سر غنچۂ خون عاشقان گلگوں کرد

# ادبیات

## بربریت

از جناب طالب جے پوری

ستم کیا کیا کیے ہیں گلشنِ ایجاد پر میں نے
بہارِ رنگ و بو میں بھر دیے برق و شرر میں نے

بنایا ہے جہنم کا نمونہ خلد زاروں کو
اڑائی ہے سرِ افلاک خاکِ رہ گذر میں نے

کمر باندھی ہے جب غارت گری امنِ عالم پر
کیا ہے درہم و برہم نظامِ خشک و تر میں نے

اٹھا کر نام پر مذہب کے فتنے دیر و کعبہ سے
بدل کر رکھ دیے پیمانہ ہائے خیر و شر میں نے

کچل ڈالی ہیں اکثر مذہب و اخلاق کی قدریں
چبا ڈالا ہے اکثر آدمیت کا جگر میں نے

مریضِ عصرِ نو کو دے کے دھوکا چارہ سازی کا
چلایا ہے رگِ انسانیت پہ نیشتر میں نے

نفاقِ باہمی کا بیج بو کر خاندانوں میں
بنائے ہیں جہنم کے نمونے گھر کے گھر میں نے

کیا ہے چاک کیا کیا حرمتِ ناموس کا دامن
ملائے کیسے کیسے خاک میں لعل و گہر میں نے

سہاگن کو رنڈاپے کی نحوست سے نوازا ہے
یتیموں کو دیا ہے تحفۂ داغِ پدر میں نے

بٹھائی ہے زبانِ معدلت پر دھاک سکوں کی
اڑائی ہے ہنسی مظلوم کی فریاد پر میں نے

فلک کی عظمتیں بھی ختم تھیں جن کے آستانوں پر
جھکایا ہے زمینِ بیکسی پر ان کا سر میں نے

عنانِ عقل دے کر جہل و نادانی کے ہاتھوں میں
کیا ہے منتشر شیرازۂ فکر و نظر میں نے



دیا ہے درس جب انسان کو کفر و ضلالت کا
کیا ہے نور پر ظلمت کو طاری سربسر میں نے

ملا تھا جس کو عرفانِ الوہیت مقدر سے
اسے اسکی حقیقت سے رکھا ہے بےخبر میں نے

مرا بذل و کرم ہے فرِ نمرودی و شدادی
کیا ہے شیطنت سے پست معیارِ بشر میں نے

بشر ہی پر نہیں موقوف کچھ مشقِ ستم میری
خدا سے بھی بغاوت کی ہے بےخوف و خطر میں نے

بہے گا کاروانِ شوق کے تلووں سے خوں برسوں
بچھائے ہیں وہ کانٹے زندگی کی راہ پر میں نے

گلستاں پر خزاں کی حکمرانی مستقل کر دی
نہالانِ چمن کو کر کے بے برگ و ثمر میں نے

## غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

جس روز سے اٹھے ہیں تری رہگذر سے ہم
گرتے ہی جا رہے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

محتاجِ حرف و لفظ نہیں داستانِ شوق
چاہیں تو دل کی بات سنا دیں نظر سے ہم

راہِ طلب میں دیر بھی ہے اُن کا در بھی ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ جائیں کدھر سے ہم

اب امتیازِ جلوہ و پردہ نہیں ہمیں
آگے نکل چکے ہیں مقامِ نظر سے ہم

اس درجہ بدحواس ہوئے فرطِ شوق میں
لکھتے ہیں پوچھ پوچھ کے خط نامہ بر سے ہم

اللہ رے پاسِ دید کہ اکثر حضورِ دوست
گذرے نظر بچا کے خود اپنی نظر سے ہم

جوہر غمِ زمانہ مٹائے گا کیا ہمیں
نظریں ملا چکے ہیں کسی کی نظر سے ہم

# مطبوعات جدیدہ

**بشیر القاری:** مرتبہ مولانا سید غلام جیلانی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۴۸، قیمت ہے۔ پتہ کتب خانہ سمنانی مدرسہ اسلامی عربی اندر کوٹ میرٹھ۔

صحیح بخاری کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما و محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، ہندوستان میں بھی اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں، مصنف نے یہ نئی شرح لکھی ہے، مگر اس میں غیر ضروری تفصیلات اور ضمنی مسائل کی بڑی کثرت ہے، اس کے اطناب کا یہ حال ہے کہ صحیح بخاری کے پہلے باب کیف کان بدء الوحی کی چھ حدیثوں کی شرح بڑی تقطیع کے ڈھائی سو صفحات میں ہے، یہ شرح عربی کے منتہی طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے مشکل الفاظ و لغات، دقیق نحوی و صرفی مسائل اور دوسرے اہم اور ضروری مباحث ہی سے تعرض کرنے کی ضرورت تھی، مگر شارح نے سمعت کے معنی، بالنیات کی ترکیب نحوی، انما کے حصر اور اسی قسم کے دوسرے جزئیات میں اپنی ساری توجہ صرف کی ہے، اسماء الرجال کی بحث میں صحابہ کے تفصیلی حالات قلمبند کیے ہیں، جو بالکل غیر ضروری ہے، اپنے مسلک کے مخالفین کی تردید میں اہلحدیث اور علمائے دیوبند کا تعاقب کیا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کو خاص طور پر طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا ہے، ان بزرگوں کے علاوہ مولانا اسماعیل شہید، شیخ عبد الوہاب نجدی، سرسید احمد خاں اور دوسرے اکابر کے متعلق جو نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں، وہ کسی سنجیدہ مصنف اور ثقہ کتاب کے شایان شان نہیں، اس طرز تحریر نے اس کتاب کو شرح کے بجائے مناظرہ کی کتاب بنا دیا ہے، شرح میں بھی تحقیق و تنقید کے بجائے خواب،



کشف، کرامات اور دور از کار تاویلات سے زیادہ کام لیا گیا ہے، کتاب کے دیباچہ میں شارح نے اپنے اور امام بخاریؒ کے حالات لکھے ہیں اور صحیح بخاری اور حدیث واقسام حدیث وغیرہ کے متعلق معلومات تحریر کئے ہیں، بہرحال یہ شرح ایک مخصوص مکتب فکر کی ترجمان ہے،

**البشیر الکامل:** از مولانا سید غلام جیلانی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت ہے، پتہ کتب خانہ سمنانی مدرسہ اسلامی عربی اندر کوٹ، میرٹھ۔

اس میں نحو کی مشہور کتاب شرح مأۃ عامل کی ترکیب نحوی اور اس کے الفاظ کی تشریح نہایت محنت وکاوش سے طلبہ کے لیے اردو میں کی گئی ہے جس سے مصنف کی درسی قابلیت اور نحوی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے، مگر اس میں بھی اطناب سے کام لیا گیا ہے، اور اپنے مسلک کے مخالفین کو سب وشتم سے نوازا گیا ہے،

**مقدمات ومقالات:** از ڈاکٹر عبد الاحد خاں خلیل، ریڈر شعبۂ فارسی واردو لکھنؤ یونیورسٹی، تقطیع خورد، کاغذ وکتابت بہتر، صفحات ۳۰۴، قیمت پانچ روپئے پچاس پیسے،
پتہ: دانش محل، امیر الدولہ پارک لکھنؤ ۔ دائرۂ فروغ اردو، امین آباد لکھنؤ۔

یہ کتاب فارسی زبان وادب سے متعلق مصنف کے پانچ بلند پایہ ادبی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں فردوسی اور آخر میں امیر خسرو کے حالات وکمالات اور شاہنامہ اور مثنوی ہشت بہشت پر تبصرہ، اور ان کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، آخر میں داستان سہراب ورستم اور مثنوی ہشت بہشت کے افسانوں کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے، دوسرے مضامین میں شیخ سعدی اور ان کی شہرۂ آفاق کتاب گلستان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، مولانا جامی کے رسالہ لوائح کے عرفانی جلووں کا ذکر بھی ہے اور غزل کی اجمالی تاریخ اور فارسی غزل کی خصوصیات کی تفصیل بھی، یہ سب مضامین نہایت مفید، پُر از معلومات اور خیالات کے اعتبار سے بھی بہت متوازن وسنجیدہ اور

اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں،

**ادیب اور کمیسار:** مترجمہ جناب گوپال متل صاحب تقطیع خورد، کاغذ متوسط کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۱۲، قیمت عہ، پتہ: نیشنل اکیڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۶

کمیونزم اپنے دعوی آزادی کے باوجود سب سے زیادہ مستبدانہ نظام حکومت ہو، چنانچہ کمیونسٹ ملکوں میں ادیبوں اور مصنفین کے قلم پر بھی بندش ہو، اس کتاب میں سوویٹ روس، چین اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کے ادیبوں اور مصنفوں پر جبر وتشدد کے واقعات کو تفصیل سے دکھایا گیا ہے، مصنف خود ان مظالم کا نشانہ رہ چکے ہیں، اور ایک عرصہ تک قید وبند کی صعوبتیں جھیل چکے ہیں، اس لیے ان کا بیان عینی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اڈیٹر تحریک گوپال متل صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اس کتاب سے کمیونزم کی اصلی تصویر نگاہ کے سامنے آجاتی ہے،

**تحقیقی مطالعے:** مرتبہ سید شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، قیمت ؎، پتہ: عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج پٹنہ ۶

مصنف اردو کے مشہور اہل قلم ہیں، مذکورہ بالا کتاب ان کے مطبوعہ اور بعض غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے، ایک مضمون نوادر اور مخطوطات پر ہے، لیکن زیادہ مضامین شعرائے اردو کے نایاب کلام، ان کے دواوین کی طبع واشاعت اور ان کی جانب منسوب اور ان کے اصلی اشعار وغیرہ کے متعلق ہیں، ایک مضمون میں ذوق کے کلام پر آزاد کی اصلاحات پر تبصرہ ہے، مصنف کو مولانا ابوالکلام سے بڑی عقیدت ہے، اس لیے ان کے ذکر میں ان کا قلم غیر محتاط ہو گیا ہے۔

**مزاحیہ شرح دیوان غالب:** از جناب غلام احمد فرقت کاکوی، تقطیع خورد،



کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۹۵ مجلد قیمت ششہ، پتہ: ادارۂ فروغ اردو ۳۶ امین آباد لکھنؤ۔

دیوان غالب کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں، غلام احمد صاحب فرقت نے اپنے خاص رنگ میں یہ شرح لکھی ہے جو اپنے طرز میں بالکل نرالی ہے، فرقت صاحب میں طنز ومزاح کا مذاق ایسا رچا ہوا ہے کہ ان کی بات بات سے ظرافت کی پھلجھڑی چھوٹتی ہے، یہ شرح اس کا نہایت دلچسپ نمونہ ہے۔

**القراۃ العربیہ:** افضل العلماء مولانا محمد یوسف صاحب کوکن عمری، تقطیع متوسط، کاغذ متوسط، کتابت وطباعت بہتر خوبصورت ٹائپ صفحات ۱۰۶، قیمت: صر سلطانہ پبلشنگ ہاؤس، ۱۰ انیٹھو لین، مدراس ۶

عربی کی یہ ریڈر مولانا محمد یوسف کوکن صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو مدراس یونیورسٹی نے ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو انگریزی یا کسی اور ہندوستانی زبان میں تکمیل کے بعد عربی سیکھنا چاہتے ہیں، کتاب کے اسباق میں اس کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عربی تعلیم کے ساتھ اس کو بولنے کی بھی مشق پیدا ہو جائے۔

**مثنوی محبت الٰہیہ:** از جناب محمد اختر صاحب پرتاب گڈھی، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۰، قیمت: عہ پتہ: ۴-جی-۱/۲ ناظم آباد، کراچی ۱۸

مصنف حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کے فیض یافتہ اور صاحب دل شاعر ہیں، مذکورہ بالا کتاب ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں مثنوی محبت الٰہیہ کے علاوہ دوسرے اصناف کا کلام بھی ہے، شروع میں حضرت پھولپوری کے مرض الموت کے حالات

اور علما، و مشائخ کے تعزیتی خطوط وغیرہ بھی شامل ہیں، یہ مجموعہ ادبی حیثیت سے قطع نظر سبق آموز ہے، جو اس کا اصل مقصود ہے،

**گل تازہ:** از جناب صلاح الدین نیر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، قیمت عہ، پتہ: صلاح الدین نیر ۴۸-۲-۶-۳۱ گونڈکی باؤلی حیدرآباد دکن ۲۶

مصنف کی غزلوں کے اس مجموعہ سے ان کی شاعرانہ استعداد اور موزونی طبع کا پتہ چلتا ہے، لیکن اس کی بعض شوخیاں سنجیدہ طبائع کے لیے بار ہیں،

**بازار رشوت:** از جناب منشی عبد الرحمٰن خان صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۷۶ مجلد، قیمت ۳ پتہ عالمی ادارۂ اشاعت علوم اسلامیہ، جہلیک، ملتان، پاکستان

لائق مرتب دین و ملت کا سچا جذبہ رکھتے ہیں، اس لیے وہ اسلامی موضوعات پر برابر مفید کتابیں لکھتے رہتے ہیں، یہ نئی کتاب انھوں نے اصلاح معاشرہ کے لیے لکھی ہے، اور اس میں رشوت کی تعریف، اس کی حرمت اور اس کے متعلق قرآن اور صحیح حدیثوں میں جو وعیدیں بیان کی گئی ہیں ان کو پیش کرکے دکھایا ہے کہ وہ عام سماج خصوصاً پاکستان کے لیے کتنی خطرناک ہے، کتاب کے آخر میں وہاں کے ارباب حکومت کو اس کے روک تھام کیلیے مفید مشورہ بھی دیا ہے، امید ہے یہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوگا،

"ض"

---

# ہماری ادبی کتابیں

دار المصنفین کے چار اہم اور مقبول ترین سلسلۂ تصنیفات یعنی سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تاریخ اسلام و تاریخ ہند کے علاوہ جن میں سے ہر ایک متعدد جلدوں پر مشتمل ہے، خالص ادبی کتابوں کا بھی ایک سلسلہ ہے، جس میں حسب ذیل کتابیں شائع ہو کر حلقۂ علم و ادب میں مقبول ہو چکی ہیں، اور جن کے لاتعداد اڈیشن اب تک نکل چکے ہیں،

شعر العجم حصہ اول، مؤلفہ مولانا شبلی مرحوم ۲۶۸ صفحے قیمت ۶/۵۰

" " دوم " ۲۶۲ " ۶/۵۰

" " سوم " ۲۰۸ " للعہ

" " چہارم " ۲۹۰ " سے

" " پنجم اس میں قصیدہ و غزل کے علاوہ فارسی زبان کی عشقیہ صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہے، ۲۳۸ " صہ

شعر الہند حصہ اول مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم ۴۹۴ صفحے قیمت عہ

" حصہ دوم ۴۶۲ " لعہ

گل رعنا مؤلفہ مولانا عبد الحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما، لکھنؤ (آب حیات کے بعد دوسرا مستند تذکرۂ شعرا، ) ۵۴۸ صفحے قیمت: عہ ۵۰

مکاتیب شبلی حصہ اول ۱۵۴ صفحے قیمت عہ

" " دوم ۲۶۴ " " صہ

کلیات شبلی اردو ۱۲۴ " " ۶/۲۵

انتخابات شبلی، مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب، جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت، اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے، (مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی) ۲۲۴ صفحے قیمت للعہ ۲۵

اقبال کامل، مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم ۴۰۶ صفحے قیمت ہے

بزم تیموریہ، مرتبہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے ۴۷۸ صفحے قیمت لعہ ۲۵

بزم صوفیہ " " ۴۶۴ صفحے " معہ